مادیت و روحانیت

افتخار احمد افتخار
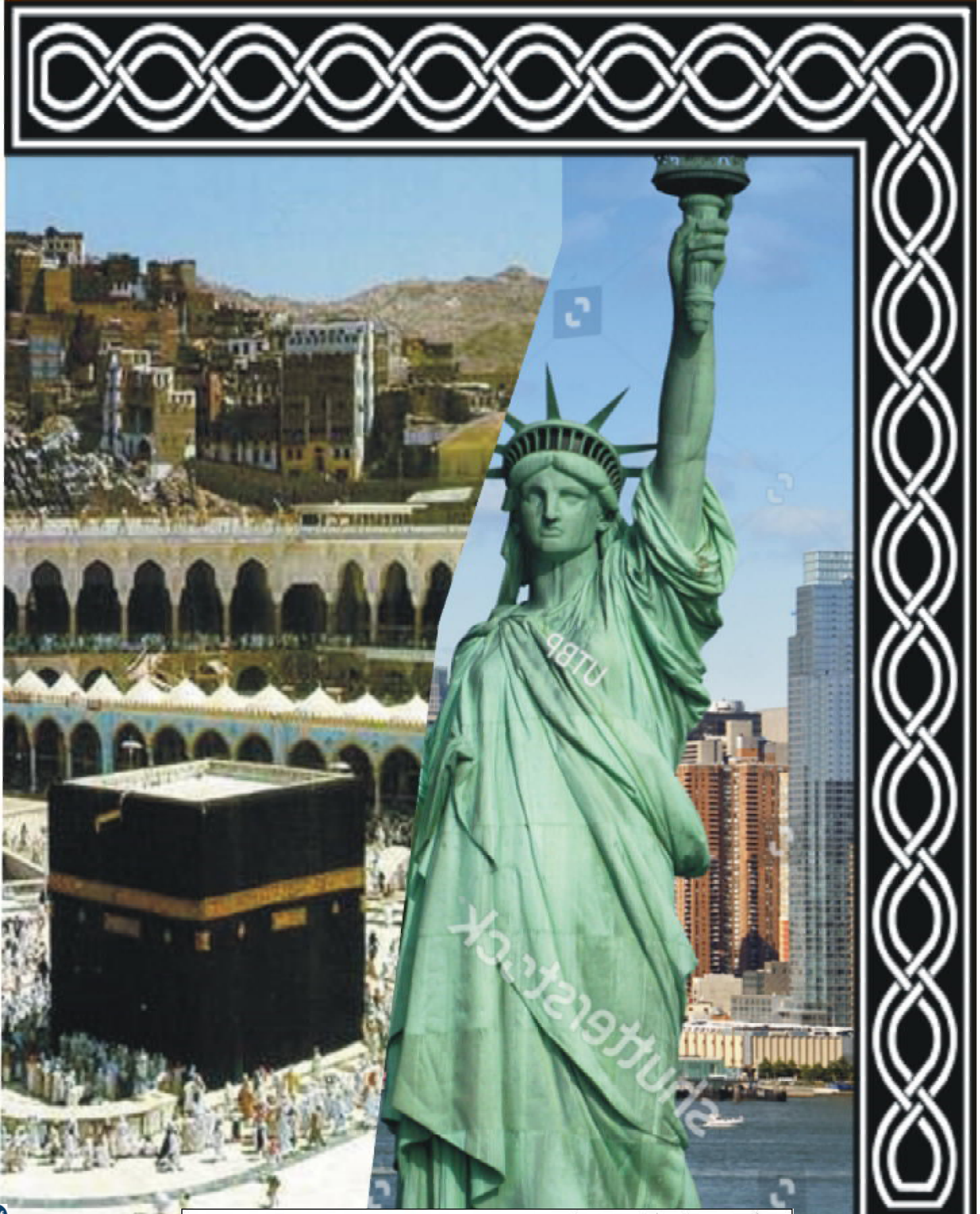
افتخار احمد افتخار

رہائش	ڈنگہ ضلع گجرات تحصیل کھاریاں
فون	03006281898
میل ایڈریس	ift1167@gmail.com
کتاب	مادیت وروحانیت
سنہ تحریر	دسمبر 2020ء
کمپوزر و ڈیزائنر	افتخار احمد افتخار
اہتمام	کتاب وسنت ڈاٹ کام
مطالعہ کے لیے	https://kitabosunnat.com
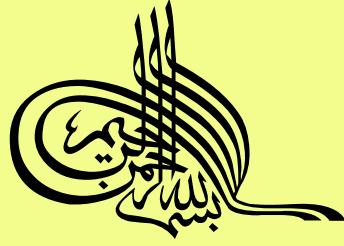
انتساب

اُن سعید روحوں کے نام جن کی منزل جنت کی قندیلیں ہیں۔

حسن ترتیب

تاریخ مادیت ، نظم روحانیت

فشارِ جنوں نے انسان کو جن سراب منزلوں کی راہ پہ ڈالا اُن پہ قدم بڑھانا ابن آدم کے لیے زیبا نہ تھا اور چاہِ فسوں میں اُس نے جن حقیقتوں کا انکار کیا وہ بھی ابن آدم کے لیے زیبا نہ تھا کہ اُسے تو کائنات کی تمام مخلوقات سے برتر مقام عطا کیا گیا تھا، اس کو عقل جیسی نعمت سے نوازا گیا تھا، جو امور حدِ ادراک سے وراء تھے اُن کے بارے میں وحی اتاری گئی تا کہ ابن آدم فریضہ خلافت کو احسن طور پہ ادا کر سکے۔ مگر حد ہے انسان کی ناشکری کی کہ اُس نے اکثر و بیشتر ہدایت کا انکار کیا اور نفس کے بہلاوے کے عوض اپنی منزل کھوٹی کی۔ صبح تاریخ سے آنے والی ہر صدا اس امر کی شاہد ہے کہ انسان شکر کی راہ سے گریزاں رہا اور اُس نے ہمیشہ خواہش و آرزو کے دامن میں پناہ لی، مادیت کی گود میں سکون کو کھوجا اور روحانیت کو پس پشت ڈالے رہا جو انسانی شخصیت کا اصل جوہر ہے۔ تاریخ کے دریچوں میں جھانک کے دیکھا جائے تو ہدایت اور گمراہی، جاہلیت و انکار، کسی خاص دور سے متعلق نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ کا ہر ورق اسی فسانے کو بیان کرتا ہے۔ تاریخ دراصل تو ایک نہایت رنگا رنگ اور بہت ہی بارونق تسلسل کا نام ہے جس میں انسانی تہذیب کے انگنت پڑاؤ ہیں، بادشاہوں کی

داستانیں اور فقیروں کے قصے ہیں، قوموں کی عظمت اور اُن کے زوال کے مناظر ہیں، انبیاء کی دعوت اور اُس سے انکار کے مظاہر ہیں، پھر اس انکار کے بدلے اللہ کے عبرت ناک عذاب ہیں جو بہت سی بدنصیب قوموں کا مقدر بنے۔ قوموں کے اسی تسلسل میں قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ ملتا ہے جس کی تاریخ الہامیات سے متصل ہے۔ یہی قوم آج جاہلیت جدیدہ کی علمبردار ہے اور اسی قوم نے آج مادیت کا علم اٹھا رکھا ہے، ان کا مسکن کم و بیش مغربی ممالک ہیں جن کو مہذب ہونے کا دعویٰ ہے۔ ان سطور میں ہم مادیت کے انھی علمبرداروں کے گزرے کل سے کچھ بحث کرنا چاہتے ہیں تاکہ روحانیت سے انکار اور مادیت پہ اصرار کی وجوہات تک کچھ رسائی حاصل کرسکیں۔

یوروپا نامی ایک شہزادی کے نام پہ بسنے والی انسانی بستیوں (یورپ) کی تاریخ ایک طویل اور مسلسل جاہلیت کی تاریخ ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس خطے کی جاہلیت کا تسلسل تاریخ کے کسی موڑ پہ نہیں ٹوٹتا، رومی جاہلیت سے ابتداء ہوئی اور یونانی فلسفے کے عجوبہ ستونوں پر سفر کرتی ہوئی قرون وسطیٰ تک پہنچتی ہے پھر اس رجعت کے پھیلاؤ میں یہودی عبقریت نے ڈارون ازم (Darwinism) کا اضافہ کر کے اس کی تباہ کاریوں میں اضافہ کر دیا اور اس کا رخ اپنے مقاصد کی طرف موڑ دیا کہ اُن کی نگاہیں ہمیشہ سے ایک عالمگیر استحصال پہ مرکوز رہیں۔ پھر نظامات عالم میں اتھل پتھل نے بیسویں صدی میں انھیں یہ موقع فراہم کر ہی دیا کہ وہ اپنے مذموم مقاصد کی طرف پیش قدمی کرسکیں۔

ظاہر سی بات ہے آج ہماری نگاہوں کے سامنے مادیت کے جو مہیب دھارے ابل رہے ہیں وہ یکلخت تو ظاہر نہیں ہو گئے بلکہ اس کے پیچھے ایک تاریخی تسلسل ہے، انکار کا ایک پیہم نظریہ ہے، افکار کا ایک مضبوط گورکھ دھندہ ہے جس کی جڑیں یورپ کی تاریخ میں بہت گہری اتری ہوئی ہیں اور یورپی مفکر کو اس سے کوئی انکار بھی نہیں ہے کہ اُس کے تمدن کی ابتدائی اینٹیں یونانی اور رومی فلسفے کے جاہلانہ بھٹے میں ڈھالی گئیں۔ ظاہر ہے وہ اسے جاہلیت نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کا ارتقاء کہتے ہیں اور ہم اسے روحانیت کے ایک عظیم تسلسل کے انکار سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وہ نظریاتی فرق ہے جس کے بطن سے روحانیت اور مادیت پسندی کے

افکار نے جنم لیا۔ اگر چہ یورپ کو بخوبی اعتراف ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں اسلامی تہذیب وتمدن کا اثر نہایت گہرا ہے، لیکن اسلامی تہذیب وتمدن کا یہ مواد اپنے اندر اسلامی رنگ لیے ہوئے داخل نہیں ہوا بلکہ یونانی اور رومی رنگ میں رنگ کر اس کی ذہنیت اپنا چکا تھا۔ پھر جب یہ مواد یورپ پہنچا تو اس پر مسیحیت کا مزید ایک غلاف چڑھ گیا جو آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ بالکل تار تار ہو گیا اور اہل مغرب کے ہاں کلیسا کے ظلم سے نجات پانی والی تحریک نے مذہب سے ہی نجات پا جانے میں عافیت جانی اور مادیت کے اُس مکروہ چہرے کو دنیا نے پہلے پہل دیکھا جس کو اصطلاع میں جدید صنعتی انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رومی جاہلیت کے مقابل یونانی جاہلیت کو مطلق جاہلیت قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ یونانی جاہلیت اپنے جلو میں علم وفن، فکر وفلسفہ، سیاسی نظریات اور علم وافکار کا بہت بڑا ذخیرہ لے کر آئی تھی جس کو علمائے مغرب نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں استعمال کیا اور دور جدید کے یورپ کو تمام تر تہذیبی وعلمی سرمایہ اسی جاہلی لٹریچر سے حاصل ہوا۔ یونان کی مذہبی دیومالا کو اگر چہ آج کے عقلی تناظر میں بچوں کی ایک کہانی قرار دیا جا سکتا ہے مگر یہ کہنا اس لیے مناسب نہ گا کہ اس سے اہل یونان کی اُس تمام ترسعی کی نفی ہو جائے گی جو انھوں نے انسانی زندگی کے بہت سے گوشوں کو نمایاں کرنے میں کی۔ مزید براں ہم اُن کو اس لیے بھی معذور خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا محض اپنی عقل کے سہارے بغیر کسی معلم اور بغیر کسی بیرونی اشارے کے حاصل کیا اور وہ اللہ کی راہنمائی کے بغیر زندگی کے معاملات میں خوب سے خوب تر کو اپنانے اور اپنے کل کو محفوظ تر کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہے۔

ان کے ہاں بہت سے قابل قدر فلاسفہ نے جنم لیا جنھوں نے انسانی سماج کے بگاڑ کو سمجھنے اور اُن کا حل پیش کرنے کی کوشش کی اگر چہ یہ کام اُن کی بساط سے باہر تھا مگر اُن کی کوششوں کو تاریخ انسانی میں کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا گیا بلکہ سماجیات سیاسیات اور علوم فلسفہ پر جب بھی اور جس محفل میں بھی بات ہو گی وہ ارسطو افلاطون اور سقراط کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ہمیں یونانی جاہلیت کے اس پہلو سے انکار نہیں کہ انھوں

نے روح کے مقابل عقل کو لا کھڑا کیا اور عقل کو اس حد تک اہمیت دے دی کہ زندگی کے ہر مسئلے میں عقل کے فیصلے کو آخری فیصلہ سمجھا گیا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے روح کے مقابل مادے کو کھڑا نہیں کیا کہ انسان محض خواہش ہی کا بندہ بن کے رہ جائے اور اس کی زندگی سے ہر قسم کے لطیف جذبوں کو کھرچ کر پھینک دیا جائے یہ تحفہ انسان کو صرف سرمایہ دارانہ نظام حیات نے فراہم کیا ہے۔ جس نے انسان کو مادیت یا دوسرے الفاظ میں آرزو و خواہش کی اُس اندھی راہ پر ڈال دیا ہے جو کسی منزل کو نہیں جاتی۔

اہل یونان کی عقلیت پسندی کو اگرچہ ایک بگاڑ کہا جا سکتا ہے مگر حق تو یہ ہے کہ انھوں نے انسان کی ایجابیت اور رفعت کو اجاگر کرنے کی ایک کوشش کی تا کہ بازار حیات میں انسان کی قیمت گراں ہو سکے۔ بلاشبہ عقل انسانی ایک عظیم ترین طاقت ہے جو اس کائنات میں انسان کے وجود اس کی قابلیت و موثریت ثابت کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن صرف انسانی عقل پر ایمان لانا ایک ایسا بگاڑ ہے جو بالآخر انسان کی قیمت کم کر کے اسے صرف "حیوان عاقل" بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے اس لیے کہ انسان حیوانوں سے الگ ایک وجود کا حامل ہے کہ اس میں اللہ نے اپنی روح سے پھونکا ہے۔ جس کی بنا صرف عقل ہی پہ نہیں رکھی بلکہ وہ اپنے تمام وجود میں بلند ہے اور اپنی خلقت کے اعتبار سے بھی حیوان سے جدا ہے انسان اپنی جداگانہ صورت و شخصیت کے لحاظ سے بھی حیوانوں سے ممتاز ہے۔

چنانچہ عقل کو روح کے مقابلے میں زیادہ مقدس قرار دینے سے ہی یونانی فکر و فلسفہ کے تمام بگاڑ جنم لیتے محسوس ہوتے ہیں اس لیے کہ تب انسان نے ہمہ جہت و ہمہ پہلو زیست کے ہر اُس امکان کو نظر انداز کر دیا جو عقل کے چوکھٹے میں پورے نہ اترتے ہوں۔ اُن کے اس برتاؤ نے نہ صرف علم کی راہ کو روکا بلکہ زندگی کی بہت راہوں کو بھی مسدود کر دیا جس کے نتیجہ میں اُن کی فہرست زیست محدود سے محدود تر ہوتی رہی۔ جب ہر وجود کو ناپنے کا پیمانہ عقل ٹھہری تو کسی خالق کا وجود بھی اسی قدر قابل قبول تسلیم کیا گیا جہاں تک اُن کی عقلی رسائی تھی اور یہیں سے اُن کی اُس مذہبی دیو مالا نے جنم لیا جس کو آج کے عقلی تناظر میں نہایت کم تر علمی معیار کی دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے جس میں کبھی تو انسان خالق کی طاقتوں کو اچکتا نظر آتا ہے تو کہیں وہ خالق کے زیر عتاب

نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک مدت تک اللہ کی ذات کو عقل کے فریم میں نسب کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں رہ گیا اللہ کے وجود کا روحانی عرفان تو اس کا تصور اہل یونان کے ہاں بہت معدوم نظر آتا ہے۔ یاد رہے کہ یونانی عقلیت پسندی ہو یا رومی مادیت کوئی بھی نظم زیست خیر سے بالکل خالی نہیں ہوتا بلکہ اپنے دامن میں متعدد خوبیاں سمیٹے ہوئے ہوتا ہے اس لیے لوگوں کی اکثریت اسے اپنانے پر خود کو مجبور پاتی ہے۔ چنانچہ یونانی عقلیت کے دامن سے بے شمار عقلی موشگافیوں نے جنم لیا جن سے بعد میں الجھے ہوئے یونانی فلسفے کی نمو ہوئی اور اسی الجھے ہوئے یونانی فلسفے نے جاہلیت کے وسطی دور میں یورپ کی طاقت سلب کئے رکھی اور اُن کی زندگی متعدد پہلوؤں سے جمود کا شکار نظر آتی ہے۔ اہل یونان کی یہی تعقل پسندی تھی جس نے انھیں کسی بھی طرح کا اخلاقی ضابطہ وضع کرنے سے روکا اور اُن کا معاشرہ باجود دنیا کو جمہوری افکار دینے کے خود ایک جمہوری معاشرے میں نہ ڈھل سکا۔

یونانی عقلیت کے برعکس اہل رومہ نے اپنے معاشرے کی ساری تعمیر مادے اور محسوسات کی بنیاد پر استوار کی جس کے بطن سے کچھ خیر اور بہت سا شر برآمد ہوا۔ رومیوں نے دنیا کے لیے سیاسی حربی اور تمدنی نظم کے ابتدائی خدوخال وضع کئے۔ رومی عہد کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اُن کا سب سے بڑا بگاڑ روح کے بالمقابل مادے پر مکمل ایمان لانا ہے جس سے ان کا دامن لطیف روحانی احساسات سے خالی ہو کر رہ گیا۔ مادیت کے ابتدائی آثار اگرچہ آج کی شدید اور بے منزل مادیت سے قدرے مختلف اور بے ضرر تھے مگر اصولی طور پر اُن کی اساس مشترک یہی رہی کہ انھوں نے کسی بھی طرح کے روحانی نظم اور لطیف احساس کو نظر انداز کرنا ہے اگرچہ وہ خود ایک مذہبی اور روحانی عقیدے یعنی مسیحیت کے پیروکار تھے۔ اہل روم اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ دنیا میں صرف وہی چیز موجود ہے جس کو چھوا جا سکے جس کو محسوس کیا جا سکے جو کچھ حد ادراک سے وراء ہے وہ کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اُن کے نزدیک جس چیز کو حواس محسوس نہ کر سکیں یا ہاتھ اس کو مس نہ کر سکیں اُس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اسی وجہ سے اہل رومہ کے ہاں عقیدہ کا وجود بے جان سا نظر آتا ہے اور اُن کا یقین صرف حسی لذتوں پہ تھا۔ وہ جنسی بے راہ روی کا شکار تھے، اُن کے جنسی رویے جب حد

ابتذال سے گزرے تو وحشت و بربریت کی وادی میں داخل ہو گئے۔ اُن کو خون بہانے، قتل کرنے اور عذاب دینے میں لطف آنے لگا۔ اُن کے ہاں کھیل کے بہت بڑے بڑے میدان سجائے جاتے جس میں نہتے انسان کو بھوکے شیر کے مقابل چھوڑ دیا جاتا، ظاہر ہے کہ ایک نہتا انسان بھوکے شیر سے کیا مقابلہ کرے گا چنانچہ جب شیر اُس انسانی جسم کو چیرتا اور اُس کا خون اور چیخیں دور دور تک جاتیں تو یہ لمحات اہل روم کے روساء کی وحشت کو سکون پہچاتے۔ بربریت اور وحشت کے کتنے ہی انداز تھے جو اہل رومہ نے اپنائے ہوئے تھے وہ دو غلاموں کو مسلح کر کے میدان میں اتارتے جو اپنے مقابل کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا اُسے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ مگر ایسا کم ہی ہوتا اس لیے کہ مقتول بھی اپنی زندگی کی خاطر لڑتے ہوئے قاتل کو اس قدر زخم ضرور دے جاتا کہ تھوڑی دیر بعد قاتل بھی ہلاک ہو جاتا اور یوں بہتا انسانی خون اُن کی حس وحشت کو سکون عطا کرتا۔

یاد رہے آج کے مادہ پرست معاشروں میں جو لوگ انسانی حقوق بلکہ جانوروں کے حقوق کی بھی بات کرتے ہیں وہ اپنے ان اسلاف کی حرکتوں پہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے اس لیے کہ اندر سے اُن کا باطن بھی اسی قدر پراگندہ ہے جس قدر اُن کے آباء وحشی تھے اور اس کا ثبوت اُن کا عمل ہے۔ مغرب کی عسکری برتری جب مستحکم ہو گئی اور مسلمان اپنے تاریخی اثاثے اور ورثے سے دور ہٹ گیا تو آج کی مہذب دنیا کے وحشیوں نے درندگی کے وہ مناظر وضع کیے جن کے سامنے اہل رومہ کی درندگی ماند پڑ جاتی ہے۔ افغانستان، الجزائر، مصر ،سوڈان ،شام، لیبیا اور عراق میں اہل رومہ کی وحشت کے وارثوں نے درندگی اور بہیمت کے وہ مناظر نقش کیے جس سے انسانیت شرما شرما گئی اس پہ مستزاد وہ انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں۔

رومی مادیت نے جاہلیت اور بے عدلی کے جو نشانات چھوڑے اُن کے وارثوں نے اُن کی پوری طرح پیروی کی۔ رومی معاشرے میں اگر کسی بھی غیر رومی کو کوئی شہری یا تمدنی حقوق حاصل نہ تھے تو آج بھی اُن کے وارثوں نے ریڈ انڈینز کی زمینوں پر قبضے کے لیے بے شمار انسانی خون بہایا اور محض رنگ و نسل کی بنیاد پر بھی اہل مغرب نے ظلم و وحشت کا جو بازار گزشتہ صدی میں گرم رکھا اُس کے بعد ان کو مہذب کہلانے کا کوئی

اخلاقی یا اصولی حق تو نہیں پہنچتا مگر دیگر اقوام کی بے حسی و کمزوری اور مسلم امہ کی باہمی منافرت نے اہل مغرب کو یہ موقع فراہم کیا کہ دنیا کی بھاگ دوڑ وحشت پرست اہل رومہ کے وارثوں کے ہاتھ میں چلی گئی جس کے استحصالی رویے سے آج کی جدید اور متمدن دنیا میں ایک تیسری دنیا کا وجود ابھرا جو اہل مغرب کے بے پناہ معاشی استحصال کا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے رکھتا ہے۔ اگر چہ دنیا کی بے شمار قومیں اذیت کی اس زندگی میں مبتلا ہونے کے باوجود چیخنے تک کے حق سے محروم کر دی گئی ہیں جس طرح کہ گزرے کل میں رومی تہذیب کا پر تعصب نظام عدل تھا جس میں غلاموں پر انگنت فرائض تو لاگو ہوتے تھے مگر حقوق کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا ہر چند مملکت رومہ میں بسنے والے غیر رومی انسانوں کی تعداد رومیوں سے بڑھی ہوئی تھی۔ غلام کی حالت کا تو رومی نظام مادیت میں کیا ذکر کیا جائے وہاں تو غیر غلام قومیں جو کچھ عقائدی یا جغرافیائی فرق کے ساتھ مملکت روم کے شہری ہونے کے دعویدار تھے اُن کو بھی کوئی شہری حقوق حاصل نہ تھے۔ مذہب اور عقائد کے نام پہ اہل رومہ میں جو خلجان پایا جاتا تھا بہتر ہوگا اس کی تفصیل اہل مغرب ہی سے فراہم کی جائے چنانچہ ایک امریکی مفکر (Dr,Dreaper) اپنی مشہور زمانہ کتاب (Fight between science and relgion) میں لکھتے ہیں کہ:

''منافقین کی وجہ سے عیسایت میں شرک و بت پرستی داخل ہو گئی تھی۔ ان منافقین نے اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کر کے بڑے بڑے حکومتی مناصب پر قبضہ کر لیا تھا ہر چند کہ انھیں دین عیسوی سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور نہ وہ مسیحیت سے مخلص تھے۔ خود کانسٹائن کا بھی یہی حال تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی ظلم اور گناہوں میں گزاری تھی اور اپنی زندگی کے آخری چند ماہ کے سوا کبھی کنیسہ کے مذہبی احکام کی پابندی نہیں کی۔ اگر چہ 637ء میں کانسٹائن کے بادشاہ بن جانے سے عیسائیوں کو بڑی طاقت ملی لیکن وہ اپنے اندر سے بت پرستی کی جڑیں نہ نکال سکے۔ عیسائیوں کی تمام کوششوں کا نتیجہ صرف اتنا نکلا کہ مسیحیت اور بت پرستی کا آمیزہ تیار ہو کر ایک نیا مذہب وجود میں آ گیا۔ اس نقطہ پر اسلام عیسائیوں سے قطعی

مختلف ہے کہ اس نے بت پرستی کا بالکل خاتمہ کر کے اپنے عقائد کی اشاعت بغیر کسی ملاوٹ کے کی۔اس دنیا کے غلام بادشاہ نے جس کے مذہبی عقائد کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے اُس نے اپنی ذاتی مصلحتوں اور عیسائیوں اور بت پرستوں کے الحاق سے دونوں نظریات کا ایک آمیزہ تیار کر دیا جس کا نام مسیحیت رکھ دیا گیا۔تعجب تو اس بات پہ ہے کہ پختہ عقیدہ عیسائیوں نے بھی اس کی زیادہ مخالفت نہیں کی بلکہ وہ الٹا یہ سمجھے کہ اگر جدید مذہب کو پرانی بت پرستی سے غذا ملتی رہی تو یہ خوب پھل پھول جائے گا اور آخر میں عیسائی بت پرستی سے چھٹکارہ پا لیں گے مگر ایسا کبھی نہ ہوسکا''۔ (1)

☆☆☆☆☆☆

آج کا مغربی شہری خود کو عیسائی کہتا ہے۔اُس سے مذہب کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ بلا کسی تردد کے کہے گا کہ وہ عیسائی ہے مگر جب اس سے اگلا سوال کیا جائے کہ بتاؤ عیسایت کیا ہے اس کے بنیادی عقائد کیا ہیں تو اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا اس لیے کہ دین آج کے مغربی شہری کی ترجیح نہیں ہے وہ مادیت کے جس نظام میں زیست کر رہا ہے اُس میں حقیقتاً کسی دین کی گنجائش بنتی بھی نہیں ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کیا دین مسیحیت کو جھوٹا دین ہے تو اس کا جواب ہے کہ نہیں اللہ سبحان تعالیٰ نے تو دیگر قوموں کی طرح ان لوگوں کو بھی عقیدہ اور شریعت دونوں سے نوازا تھا۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا کہ؛

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ۔

القرآن الحکیم (سورۃ بقرۃ)

ترجمہ؛

انجیل تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تاکہ میں تم حلال کر دوں بعض وہ چیزیں جو پہلے تم پہ حرام کر دی گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆

مگر اُس عہد میں بھی جب اہل کلیسا کو یورپ میں زبردست اقتدار حاصل تھا تب بھی اُس میں مذہبی روح قطعاً نہ تھی۔ انفرادی حیثیت سے اگر کوئی شخص قانون الٰہی کا پابند رہا ہو تو اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے مگر عمومی طور پر ریاست میں قانون الٰہی کی بجائے رومی قانون ہی چلتا رہا، یا یوں کہہ لیجئے کہ عیسائیت پہ ہمیشہ سے قدیم رومی جاہلیت ہی حاکم رہی ہے۔ عہد وسطیٰ کے عیسائی معاشرے میں کلیسا کے اثرات بڑے گہرے اور دور رس تھے اور لوگوں کے ذہن کلیسا کی عظمت سے مرعوب تھے۔ مگر حیرت ہے کہ اس کے باوجود بھی زندگی کے سارے معاملات میں رومی قانون کے تحت ہی نمٹائے جاتے۔ یوں کلیسا نے اپنے غلط طرز عمل سے رومی قانون کے توسع اور ہمہ گیری کے خاص مواقع فراہم کر دیئے تھے۔ دین و دنیا کی دوئی ان کے ذہنوں پر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ کاہنوں نے دنیا دوسروں کے لیے چھوڑ کر آسمانی بادشاہت اپنے حصے میں لگا لی تھی اور اب جنت میں وہی داخل ہو سکتا تھا جسے کاہنوں کی خوشنودی حاصل ہو۔ باقی سب لوگ خود کو اس سے محروم خیال کریں۔

کلیسا کی گرفت معاشرے پر اتنی سخت تھی کہ اُس نے لوگوں کی دولت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی عقل و روح تک بھی ٹیکس لگا رکھے تھے۔ اہل کلیسا نے حبس کا ایسا موسم معاشرے پہ چھائے رکھا کہ لوگوں کا سانس رک رک جاتا تھا۔ لوگوں سے عشر و تاوان لیا جاتا، انھیں بیگار پر مجبور کیا جاتا، ان سے کہا جاتا کہ کلیسا کی زمینوں پر بغیر کسی اجرت کے کام کرو اللہ تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔ پھر کلیسا نے پرائیویٹ فوج بھی رکھی ہوئی تھی جو کلیسا کے خلاف بغاوت کرنے والے چھوٹے موٹے بادشاہوں کو سزا دیتی۔ تب رواج تھا کہ جب کاہن کسی راستے سے گزرے تو لوگ اس کو سجدہ کریں، جو ایسا نہ کرتا کلیسا کے کارندے اُس کے خاندان کا نام و نشان تک مٹا دیتے۔ کلیسا کا سب سے بڑا اور سب سے عظیم جرم یہ ہے کہ وہ علم کی راہ آ کھڑا ہوا۔ اہل کلیسا

کے پاس کچھ مفروضہ اور بے بنیاد علمی نظریات تھے جنھیں وہ زبردستی لوگوں کے ذہنوں میں ٹھونسا کرتا۔ پھر جب بھی کسی نے ان بوسیدہ نظریات کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی کلیسا نے سختی کے ساتھ اُس کا گلہ گھونٹ دیا۔ حتیٰ کہ ڈارون نے اپنی کئی کتابوں کو تب تک چھاپنے سے گریز کیا جب تک کہ کلیسا کا زور کچھ کم نہ ہو گیا ورنہ اس سے پہلے تو اہل کلیسا سائنس دانوں کو زندہ جلا دیا کرتے تھے جیسا کہ انھوں البرٹ برونوں کے ساتھ کیا۔ اور جیوانوں، کوپرنیکس اور گلیلیو جیسے سینکڑوں سائنس دانوں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ کلیسا کی جہالتیں ہمہ گیر اور ہمہ پہلو تھیں۔ انھوں نے اپنے دین پر اُس طرح عمل کرنا مناسب خیال نہ کیا جس کا انھیں حکم دیا گیا تھا بلکہ انھوں نے از خود ہی لوگوں پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیں تھیں جن کا کوئی جواز تھا اور وہ سراسر غیر فطری بھی تھیں۔ چنانچہ اُن کی رہبانیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ؛

وَرَہۡبَانِیَّۃَ ابۡتَدَعُوۡہَا مَا کَتَبۡنٰہَا عَلَیۡہِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰہِ فَمَا رَعَوۡہَا حَقَّ رِعَایَتِہَا....

القرآن الحکیم (سورہ الحدید ، آیت۲۷)

ترجمہ؛

اور راہبانیت جو انھوں نے ایجاد کر لی تھی وہ تو ہم نے ان پر فرض نہ کی تھی مگر اللہ کی رضا مندی کے لیے، مگر انھوں نے اس کی بھی پوری پوری رعایت نہ کی''۔

☆☆☆☆☆☆

حقیقت یہ ہے کلیسا کہ نے ایک الہامی دین کا حلیہ ہی بگاڑ دیا یہاں تک کہ وہ اخلاقی پستی کی آخری حدوں کو چھونے لگے۔ بالآخر تاریخ نے وہ دن بھی دیکھے جب کلیسا کے پادری لوگوں سے پیسے لے کر اُن کو جنت کی ٹکٹ جاری کرنے لگے۔ کلیسا چاہتا تھا کہ لوگ جہالت کی حالت میں رہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر لوگوں

نے علم حاصل کر لیا تو کلیسا کا نام و نظام ختم ہو جائے گا۔ صدیوں ظلم کے یہ اندھیرے قائم رہے پھر زمانے نے کروٹ لی جس کو تاریخ دان یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک مغربی مورخ (Breafalt) اس ضمن میں اپنی کتاب (The Making Humainty) میں لکھتا ہے کہ؛

''یورپ کی جدید دنیا پر عرب اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا احسان علم ہے لیکن اس کے نتائج کافی بعد میں رونما ہوئے۔ جس عظیم جینئس نے اسپین میں عربی تہذیب کو جنم دیا تھا وہ ایک طویل وقت گزارنے کے بعد اپنے شباب کو پہنچی اور تنہا علم نے ہی یورپ کو حیات نو عطا نہیں کی بلکہ اس میں اسلامی تہذیب اور بہت سے مؤثرات کارفرما رہے تھے جس اسلامی تہذیب نے اپنے اُفق کی پہلی کرنیں اسلامی تہذیب پر ڈالیں۔ بلاشبہ یورپ کی تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اسلامی تہذیب سے متاثر ہوئے بغیر رہ گیا ہو بلکہ اسلامی تہذیب نے تو کچھ ایسے محرکات بھی فراہم کئے تھے جس نے جدید دنیا کو اصل اور ممتاز ترین قوت عطا کی یعنی علوم طبیعہ اور علمی بحث کی روح''۔ (۲)

☆☆☆☆☆☆

ظاہر ہے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی روح یا اساس مذہب بیزاری پر استوار ہوئی تھی اس لیے اُس کے نتائج سراسر لادینی طور زیست (Secular Life Style) کو لیے ہوئے تھے جس کے مظاہر آج کی مغربی تہذیب میں اپنے عروج کو دیکھ رہے ہیں اور مادیت کا وہ ظالمانہ نظام وضع کر دیا گیا ہے جس میں دنیا کی تمام تر دولت کا کثیر ترین حصہ آٹھ مغربی ممالک میں بانٹ دیا گیا جو (G8) کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اس ظلم کے نتیجے میں دنیا کی کثیر آبادیاں بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہو گئیں۔ صدیوں تک ایک ایسے نظام زندگی کو اپنائے رکھنے سے جو روحانی لطائف سے عاری ہو دل میں جو سختی پیدا ہوتی ہے اُس کے مظاہر (G8)۔ (word bank) اور (IMF) جیسے مغربی اداروں کی پالیسیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں جو

تیسری دنیا کے ہر انسان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتے ہیں تا کہ اہل مغرب کی پر آسائش زندگی میں کوئی تعطل نہ آسکے۔ چاہے اس کے لیے افریقہ و ایشیا کے لاکھوں لوگ بھوک سے مر جائیں۔ تیسری دنیا کے بھیانک مناظر انسانیت کو یہ باور کرانے کے لیے کافی ہیں کہ کسی بھی اخلاقی احساس سے عاری مادیت کا وہ نظام جیسے مغربی مادیت کہا جاتا ہے ایک ایسی لعنت ہے جو اخلاقی انحطاط کی دلیل ہے، بے حسی کی دلیل ہے، وحشت کی دلیل ہے، سب سے بڑھ کے ایک غیر روحانی معاشرے کے بیمار ذہنی رویے پہ دلیل ہے جو لذتیت اور مادی کے بخار میں مبتلا کثیر انسانی آبادیوں کی محرومیوں کا باعث ہے۔

نظم روحانیت؛

انسان اور کائنات دو بدیہی حقیقتیں ہیں جو صدیوں سے موضوع بحث رہی ہیں۔انسان اور کائنات کے متعلق علمی توجیہات کے وہ ذخائر آج موجود ہیں جو تاریخ کے کسی دور میں بھی دستیاب نہ تھے مگر یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ صدیوں پہ محیط یہ سب علمی کاوشیں انسان کو کسی نتیجے تک نہ لے جاسکیں بلکہ اُس کے خلجان میں مزید اضافے کا باعث بنیں۔اس کی جو وجہ میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ کئی صدیوں سے علم کے جو دھارے انسانی راہنمائی کے لیے دستیاب ہوئے وہ تمام تر ایسے معاشروں اور سماج سے متعلق تھے جو خود کسی روحانی سے نظم سے عاری تھے اس لیے بغیر کسی روحانی عرفان کے اُس عظیم حق تک پہنچنے کے لیے انھوں نے جو راہ اختیار کی وہ انھیں منزل سے دور لے جاتی رہی حتیٰ کہ ایک موڑ پر پہنچ کر اہل مغرب کے علماء نے روح اور مادہ میں سے مادہ کو اختیار کر لیا اور اس میدان میں خوب ترقی کی۔آج کی دنیا کی بیشتر رونق اسی مادی تہذیب میں ارتقاء کا نتیجہ ہے۔مگر یہ بھی ایک سچ ہے کہ زمین کے سینے پر مسلمان ایک واحد قوم ہیں جن کے پاس روحانیت کا ایک عظیم خزینہ موجود ہے جو قرآن کی صورت دنیا کی راہنمائی کے لیے محفوظ ہے۔مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ مسلمان سمیت کوئی بھی الہامیات کے اس عظیم خزینے کی طرف متوجہ نہیں جس کے پاس انسان کے سینے میں ابلتے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔جو انسان اور کائنات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور انسان کو اُس راہ کی طرف دعوت دیتا ہے جس پہ چل کے وہ ان روشن چراغوں تک پہنچ جاتا ہے جن کی روشنی سے منزل کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔مادیت و روحانیت دو مختلف طرز زیست ہیں جو انسان کو دو مختلف منزلوں کی طرف لے جاتے ہیں۔دنیا کی اس ہمہ جہت رونق پہ غور کریں تو آپ جانیں گے کہ زمین پر موجود ہر نفس انھی

دوطور زیست میں سے ایک کا پیرو ہوگا۔ معاشرے اور تہذیبیں، قومیں اور ملک حتیٰ کہ براعظم تک اسی تقسیم پر عمل پیرا ہیں۔ انسان کی قدیم تاریخ بھی اس بات کی شاہد ہے انسان میں ہمیشہ دو گروہ ہی نمایاں رہے ہیں ایک وہ جو کسی روحانی نظم کسی الہامی تعلیم کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں اور دوسرے وہ جو انسان و کائنات کی تخلیق میں کسی خالق کو شامل کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ انسان اور کائنات اور ان دونوں کے مابین باہمی تعلق کو مختلف زمانوں میں مختلف قومیں یا مختلف مذاہب کس طرح اجاگر کرتے رہے یہ ایک بہت لمبی اور لایعنی بحث ہے جسے نظرانداز کرتے ہوئے ہم یہاں صرف دو گروہوں کا نقطہ نظر پیش کریں گے جو ان سطور میں زیر بحث ہیں یعنی روحانی طرز زیست کے پیرو یا پھر مادیت پرست۔ مادیت پرست اس کائنات کو سلسلہ تسلسل کی ایک کڑی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ کائنات محض ایک اتفاق میں وجود آ گئی تھی اور ایک تسلسل ہی اسے تھامے ہوئے ہے اور انسان پیدا ہوتا اور پھر مر جاتا ہے۔ اُن کے ان دلائل کی اساس اُن معاصر طبیعی علمی نظریات پہ رکھی ہے جو کئی صدیوں سے مذہب بیزاروں کے ہاں مقبول چلی آ رہی ہے۔ دوسری روحانیت پسند طبقہ ہے جن کے مطابق یہ کائنات ایک خالق نے قائم کی ہے اور وہی اس کے نظام کو چلا رہا ہے اُن کا یقین الہامیات پہ ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ○

القرآن الحکیم (سورہ الدخان - آیت 38)

ترجمہ؛

ہم نے زمین و آسمان اور اس کے بیچ جو کچھ بھی ہے عبث پیدا نہیں کیا۔

☆☆☆☆☆☆

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ؛

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ

وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ روم ۔ آیت 8)

ترجمہ؛

کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کو بہترین قرینے سے ایک مقررہ وقت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہاں مگر اکثر لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ○ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران ۔ آیت 190.191)

ترجمہ؛

"آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے اور غور و فکر کرتے ہیں زمین و آسمان کی پیدائش میں اور کہتے ہیں اے پروردگار یہ سب کچھ تو نے بے مقصد نہیں بنایا تو اس سے پاک ہے، پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے"۔

☆☆☆☆☆☆

کائنات کی مقصدیت اور غرض و غایت کی ان آیات پر نگاہ ڈالنے کے بعد یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کہ بھی کچھ تشریح کر دی جائے تاکہ بات کی وضاحت ہو سکے۔ بیان کیا گیا کہ انسان نہ تو اس قدر ادنیٰ مخلوق ہے کہ جانوروں، درختوں پہاڑوں، آگ، بادل، بجلی چاند، سورج، اور ستاروں کے آگے سر جھکاتا پھرے اور نہ ہی وہ اس قدر ارفع ہے کہ عقل کے سہارے اُس کے ہاتھ خالق کے گریبان تک جا پہنچیں اور وہ تکبر کی راہ پہ چل پڑے اور اللہ کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلے۔ سرسری سی نگاہ ڈالنے سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ زمین کے سینے پر اِن دونوں قسموں کے بے پناہ لوگ موجود ہیں جو ایک طرف تو شرف کے ہر احساس سے تہی پتھر اور مٹی کے بتوں کے آگے سر جھکا رہے ہیں اور انھیں اس بات کی ذرا بھی خبر نہیں کہ انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نیابت کے لیے اتارا ہے اور وہ کائنات کی سب سے ارفع مخلوق ہے۔

ہمارے قریب ہی ہندوستان میں ایک ارب سے زائد لوگ بت پرستی میں ملوث ہیں اور عقل کے اندھوں کی طرح بغیر سوچے سمجھے اپنے آباء کے دین پہ قائم چلے آئے ہیں۔ ہماری (پاکستان) سرحد کی دوسری طرف یعنی مغرب میں روس اور چین میں تقریباً دو ارب لوگ اللہ کے وجود سے انکاری ہیں اور بغیر کسی دلیل کے اس امر کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اُس سے پرے مغرب ہے جو کہنے کو تو خود کو نصاریٰ کہتے ہیں مگر حقیقت میں اُن کے نزدیک نہ کوئی خالق ہے اور نہ ہی خالق کے مخلوق پر کچھ حقوق ہیں۔ وہ مادیت کی منزلوں کے مسافر ہیں اور اپنے اہداف کے حصول میں اس قدر الجھ کے رہ گئے ہیں کہ اُن کے پاس اس بات پہ فکر کرنے کے لیے وقت ہی نہیں کہ آخر خالق نے انھیں اس زمین پر کیوں اتارا ہے۔ لوگوں کا وہ گروہ جو بتوں کا پجاری ہے اخلاقی اور فکری طور پہ اس قدر پست ہے کہ اُس کے مزید تذکرے کی ہم ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ وہ ارذل لوگ ہیں اگرچہ انھیں دعوت کی ضرورت ہے مگر وہ اپنے حالات اور اعمال پہ مطمئن ہیں اگرچہ مسرور نہیں۔

دوسری طرف متکبرین ہیں جو اللہ کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں اور کسی خالق کے وجود سے عاری ہیں۔ یہ دنیا جس میں ہم بستے ہیں اس میں کثیر تعداد اُن لوگوں کی ہے جو تکبر کے جرم میں مبتلا ہیں۔ یہود نصاریٰ اور ملحدین میں اگرچہ کچھ فکری تفاوت موجود ہے مگر عملی طور پر وہ ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی متکبرین

کے قبیلہ سے، چنانچہ قرآن حکیم میں اِن متکبرین کو اُن کی اصل اوقات یاد دلانے کے لیے جا بجا بہت سی آیات اتاری گئی ہیں جن سے یہاں استفادہ مقصود ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ○ خُلِقَ مِن مَّاء دَافِقٍ ○ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الطارق 5-7/86)

ترجمہ:

”انسان اپنی حقیقت کو تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان کھنچ کر آتا ہے“۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ طارق میں ارشاد ہوا کہ :

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَنَسِيَ خَلْقَه۔

القرآن الحکیم (سورۃ الطارق 77-78/36)

ترجمہ؛

”کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اُس کو ایک قطرہ آب سے بنایا ہے اور اب وہ کھلم کھلا ہمارا حریف بنتا ہے، ہمارے لیے مثالیں دیتا ہے اور اپنی اوقات کو بھول گیا ہے“۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ سجدہ میں فرمایا گیا کہ :

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ (7) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ

مِّن مَّاء مَّهِينٍ (8) ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ السجدہ 32/9-7)

ترجمہ:

''انسان کی ابتدا مٹی سے کی، پھر مٹی کے نچوڑ سے جو ایک حقیر پانی ہے اس کی نسل چلائی پھر اس کی بناوٹ درست کی اور اُس میں اپنی روح پھونکی''۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ حج میں انسان کے تخلیقی مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرمایا جاتا ہے کہ:

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاء إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّى وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ الحج 5/22)

ترجمہ؛

''ہم نے تم کو مٹی سے، پھر قطرہ آب سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر پوری اور ادھوری بنی ہوئی بوٹی سے پیدا کیا تا کہ تم کو اپنی قدرت دکھائیں۔ اور ہم جس نطفہ کو چاہتے ہیں ایک مدت مقررہ تک رحم مادر میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر تم کو بڑھا کر جوانی کو پہنچاتے ہیں۔ تم میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد پھر نا سمجھ ہو جائے''۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ الانفطار میں فرمایا کہ :

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ○الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ○فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاء رَكَّبَكَ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانفطار 82/8-6)

ترجمہ؛

''اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور کر دیا ہے؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے اعضاء درست کیے، تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترتیب دی''۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ النحل میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَاللّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لاَ تَعْلَمُونَ شَيْئاً وَجَعَلَ لَكُمُ الْسَّمْعَ وَالأَبْصَارَ وَالأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ○

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 78/16)

ترجمہ؛

''اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، جب تم نکلے تو تم اس حال میں تھے کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس نے تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں دل دیئے شاید کہ تم شکر کرو''۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ مریم میں فرمایا کہ :

أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ○أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ○

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ○عَلَى
أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ○وَلَقَدْ
عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَى فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ○أَفَرَأَيْتُم مَّا
تَحْرُثُونَ ○أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ○لَوْ نَشَاءُ
لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ○إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ○بَلْ
نَحْنُ مَحْرُومُونَ ○أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ○أَأَنتُمْ
أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ○لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ
أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ○أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ○
أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ○نَحْنُ جَعَلْنَاهَا
تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ ○فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ مریم 56/58-74)

ترجمہ؛

''کیا تم نے اُس نطفہ پر غور کیا ہے جسے تم عورتوں کے رحم میں ٹپکاتے ہو؟ اس سے بچہ تم پیدا کرتے ہو یا ہم اس کے پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے ہی تمھارے درمیان موت کا اندازہ مقرر کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمھاری جسمانی شکلیں بدل دیں اور ایک اور صورت میں تم کو بنا دیں جس کو تم نہیں جانتے، اور تم پہلی پیدائش کو تو جانتے ہی ہو پھر اس سے سبق حاصل کیوں نہیں کرتے؟ پھر کیا تم نے دیکھا کہ یہ کھیتی باڑی جو تم کرتے ہو اِس کو تم اگاتے ہو یا اِس کو اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس بنا دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم نقصان میں رہے بلکہ محروم رہ گئے۔ پھر کیا تم نے اس پانی کو دیکھا ہے، جسے تم پیتے ہو؟ اس کو تم نے بادلوں سے اتارا ہے یا اس کو اتارنے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو کھاری بنا دیں۔ پس کیوں تم شکرادا نہیں کرتے؟ پھر تم نے اس آگ کو دیکھا ہے جسے تم سلگاتے ہو؟ جن درختوں سے یہ لکڑی لائی جاتی ہے اُن کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم نے؟ ہم نے اس کو ایک یاد دلانے والی چیز اور مسافروں کے لیے سامانِ زیست

بنایا ہے۔پس اے انسان اے اپنے خدائے بزرگ و برتر کی تسبیح کیا کرو‘‘۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا کہ :

وَإِذَا مَسَّكُمُ الْضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلاَّ إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الإِنْسَانُ كَفُوراً ۝ أَفَأَمِنتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِباً ثُمَّ لاَ تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلاً ۝ أَمْ أَمِنتُمْ أَن يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفا مِّنَ الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُم بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لاَ تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعاً ۝

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل 17/67-69)

ترجمہ:

’’جب کبھی سمندروں میں تم پر طوفان کی مصیبت آتی ہے تو تم اپنے سب معبودانِ باطل کو بھول جاتے ہو اور اس وقت تمھیں صرف اللہ رب العزت کی یاد آتی ہے۔پھر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو تم پھر پرانی روش پر لوٹ آتے ہو۔انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ خدا تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے اور تم کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ۔کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ خدا تم کو دوبارہ اس سمندر میں لے جائے اور تم پر ہوا کا ایسا طوفان بھیج دے تو تمھیں نافرمانی کے بدلے میں غرقاب کر دے اور پھر تم ہمارا پیچھا کرنے والا کسی کو حمایتی نہ پاؤ گے‘‘۔

☆☆☆☆☆☆

یہ محض کچھ آیات تھیں جو اس ضمن میں پیش کی گئیں جن میں انسان کو تکبر کے رویے سے باز رہنے کی

تلقین کی گئی ہے۔خدا کے انکار سے روکا ہے، خدا کی خدائی میں اکڑ اکڑ کر چلنے سے ٹوکا ہے، اِن آیات میں انسان کے غرور وتکبر کو محض جہالت اور بلا جواز قرار دیا گیا ہے اور اُس کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی گئی ہے کہ پانی کے محض ایک اچھلتے ہوئے گندے قطرے سے تمھارا آغاز کیا گیا ہے۔اُس حقیر پانی کے قطرے کی رحم مادر میں پرورش کی جاتی ہے اور وہ گوشت کے لوتھڑے میں بدل جاتا ہے۔خدا چاہے تو اس لوتھڑے میں جان ڈالے چاہے تو یونہی وہ غیر مکمل حالت میں خارج ہو جائے۔خدا اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے، اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور اسے اُن آلات اور اُن قوتوں سے مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو یاد کراتا ہے کہ جب تم دنیا میں آئے تو کس قدر بے بس تھے، تم اپنی کوئی حاجت پوری کرنے پر قادر نہ تھے۔تو وہ خدا ہی تھا جس نے اپنی قدرت سے ایسا اہتمام کیا کہ محبت سے تیری پرورش کی جائے، تو بڑھتا رہا، جوان ہوا طاقتور اور قادر ہوا اللہ نے تجھے نعمتوں سے نوازا مگر تو نے اُس کا شکر ادا نہ کیا۔تو دولت کے پیچھے بھاگا پھرا اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کا غلام رہا۔تو نے ایک بار بھی نہ سوچا کہ تجھے کس لیے پیدا کیا گیا ہے۔تو نے شرک کیا۔حالانکہ تیرا رب اگر چاہتا تو تجھ سے تیرے گناہوں کا بدلہ ایک لمحے میں لے لیتا وہ تجھے بدترین سزا دیتا مگر اُس کا حلم اور رحم ہی ہے جو تجھ کو تیرے گناہوں سمیت اپنی زمین پر چلتا رہنے دیا۔

اے غافل انسان سُن!

اگر اللہ چاہتا تو ہوا کو حکم دیتا وہ رُک جائے تب تو سانس کیسے لیتا، اگر اللہ چاہتا تجھے پانی نہ ملے تو وہ سمندروں دریاؤں اور بادلوں کو حکم دیتا کہ غائب ہو جاؤ اور اگلے روز جب تم سو کر اٹھتے تو تم جانتے کہ کہیں بھی پانی نہیں تب تم کیا کرتے؟ یہ روشنی، یہ ہوا، یہ انواع اقسام کے پھل، یہ غلہ، یہ رنگ رنگ کے سامانِ زیست آخر تم کو کس نے عطا کیے اللہ نے اور تم اللہ کے خلاف باتیں کرتے ہو اللہ کی حکومت اور اقتدار کو افسانہ قرار دیتے ہو۔افسوس ہے تم پر کہ تم کو عقل عطا کی گئی اس کے باوجود تم اپنے خالق کی حکمت اور دانائی تک نہ پہنچ سکے اور اُس کی نعمتوں کا شکر کرنے کی بجائے اُسی کی زمین میں فساد پھیلانے لگے۔تو نے لوگوں سے برا سلوک کیا، لوگوں کا حق مارا، لوگوں کو اذیت دی

،دھوکے دیئے، کفر کیا، شکر سے دور رہے، حتیٰ کہ تیری مہلت عمر گزرتی رہی، پھر تیرے اعضاء میں کمزوری آنے لگی، پھر تو بوڑھا ہوگیا، پھر تو بستر سے لگ گیا مگر تو نے کبھی توبہ نہ کی اپنے خالق کے در پہ اپنے گناہوں اور غلطیوں کا اعتراف نہ کیا حتیٰ کہ قبر کی مٹی نے تجھے اپنے اندر سمولیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تکبر سے روکا اور اُس کو اُس کے اصل مقام سے آگاہ کیا۔ اب اسی تصویر کا دوسرا رخ دکھایا جاتا ہے جس میں انسان کو بتایا گیا کہ یہ درخت، یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ بجلی، یہ بادل، یہ آگ اس لیے پیدا نہیں کی کہ تو اِن اشیا کے سامنے جھک جائے بلکہ یہ سب کچھ تو تمھاری خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، یہ سب تو تیرے غلام ہیں اور تو ہے کہ عقل سلیم کے باوجود اپنے ہی غلاموں کے سامنے سر جھکانے لگا حالانکہ اللہ نے تو تجھے بلند رتبوں سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انسان کی جس تکریم اور رتبے کو بیان کیا ہے اس ضمن میں چند آیات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے تا کہ انسان شکر کی راہوں کی طرف مراجعت کر سکے اور سر کائنات اپنے مرتبے کو پہچان سکے ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۞

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل 17/70)

ترجمہ:

”اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور اُن کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور اُن کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی اُن چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں اِن کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے“۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ نحل میں فرمایا گیا کہ :

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (6)
وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ
الْأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ (7) وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ
وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (8)
وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ
أَجْمَعِينَ (9) هُوَ الَّذِي أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُم مِّنْهُ
شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ (10) يُنبِتُ لَكُم بِهِ
الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (11) وَسَخَّرَ لَكُمُ
اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (12) وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي
الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ
(13) وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا
وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ
وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (14) وَأَلْقَى فِي
الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ
تَهْتَدُونَ (15) وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (16) أَفَمَن
يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (17) وَإِن تَعُدُّوا
نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (18) وَاللَّهُ يَعْلَمُ
مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 5-19/16)

ترجمہ:

"اور ہم نے جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمھارے لیے سردی سے حفاظت کا سامان ہے اور

دیگر فائدے ہیں جن میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔اِن میں تمھارے لیے ایک شان و جمال ہے جب کہ تم صبح اُن کو لے کر جاتے ہواور شام کو واپس لاتے ہو۔وہ تمھارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر شدید دقت کے نہیں پہنچ سکتے۔تمھارا رب بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔گھوڑے اور خچر اور گدھے تمھاری سواری کے لیے ہیں اور سامانِ زیست ہیں۔خدا اور بہت سی چیزوں کو پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے۔وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا،اس میں سے کچھ تمھارے پینے کے لیے ہے اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن سے تم اپنے جانوروں کے لیے چارہ حاصل کرتے ہو۔اسی پانی سے خدا تمھارے لیے کھیتی اور انگور اور طرح طرح کے پھل اُگاتا ہے۔اِن چیزوں میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔اسی نے تمھارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کیے ہیں، یہ سب اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں اِن میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ مختلف الانوع چیزیں ہیں جو اللہ نے زمین میں تمھارے لیے پیدا کی ہیں، اِن میں سبق حاصل کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی) نکال کر کھاؤ،اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) نکال کے پہنو۔اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئیں سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔چنانچہ سمندر کو اس لیے بھی مسخر کیا گیا کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجالاؤ۔اس نے زمین میں پہاڑ لگا دیئے کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ۔اور بہت سی علامات بنائیں منجملہ اُن کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں اور کیا پیدا کرنے والا اُس کے برابر ہوسکتا ہے جو پیدا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو اُن کو بے حساب پاؤ گے۔اللہ واقعی بڑی مغفرت والا اور بہت رحم کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ تمھارے پوشیدہ اور کھلے ہوئے تمام رازوں سے آگاہ ہے"۔

(۳)

☆☆☆☆☆☆

اوپر جو آیات تحریر کی گئی ہیں اُن میں انسانی سوچ کے دو پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور اُس کی رہنمائی فرمائی گئی ہے۔ اول یہ کہ انسان سر کائنات اپنے مقام کو سمجھے اور جانے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں دخل اندازی نہیں کرسکتا۔ وہ انتہائی حقیر ہے اُس کی خدائی کے مقابل وہ بہت حقیر ہے اس لیے اُس کو زیبا نہیں کو وہ اپنا ہاتھ خالق کے گریبان تک لے جائے اور تکبر کی راہ کو چل دے، پھر فرمایا کہ انسان اس قدر ہیچ بھی نہیں ہے کہ وہ درختوں، پتھروں، بادل، بجلی اور آگ اور لکڑی اور پتھر کے بتوں کو اپنا معبود بنالے اور اُن سے حاجت روائی کے لیے اُن کو پکارنا شروع کردے۔ انسان کو بتایا گیا کہ اُس کا رتبہ اس سے بہت بلند ہے اور وہ زمین پر اللہ کا نائب ہے اُس کا خلیفہ ہے تمام کائنات کو اُس کے لیے مسخر کردیا گیا ہے تاکہ وہ اللہ کے احکامات کی پیروی میں کوئی دقت محسوس نہ کرے۔ چنانچہ اُس کو بتایا جارہا ہے کہ وہ اللہ کا نائب ہے اور اُس کو اللہ کی عظمت اور بزرگی کے گیت گانے ہیں تاکہ وہ خود کو حق نیابت کا اہل ثابت کرسکے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ (30) وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاء كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاء هَؤُلاء إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (31) قَالُوا سُبْحَانَكَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (32) قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ (33) وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلاَئِكَةِ اسْجُدُواْ لآدَمَ

فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (34) وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَـٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ (35) فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/30-35)

ترجمہ؛

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انھوں نے کہا! اے ہمارے رب کیا تو اُس کو زمین میں اپنا نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا، اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اُس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا، اگر تم سچے ہو تو مجھے اِن چیزوں کے نام بتاؤ؟ انھوں نے کہا' پاک ہے تیری ذات ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو توں نے ہم کو سکھایا ہے، اور تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا! اے آدم اِن فرشتوں کو اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ پس جب آدم نے فرشتوں کو اُن چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا' میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں جو کچھ تم چھپاتے اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو مجھے اُن سب کا علم ہے۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اُن سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکنا کہ تم ظالموں میں

سے ہو جاؤ مگر شیطان نے اُن کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اُس سے اُن کو نکلوا دیا''۔(۴)

☆☆☆☆☆☆

سورہ حجر میں فرمایا کہ :

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَراً مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (28) فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُواْ لَهُ سَاجِدِينَ (29) فَسَجَدَ الْمَلآئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ (30) إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى أَن يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ (31) قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلاَّ تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ (32) قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (33) قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (34) وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ○

القرآن الحکیم (سورۃ الحجر 12/11)

ترجمہ؛

''اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں کالے، سڑے ہوئے، سوکھے ہوئے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اُس کو سجدہ کرنا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا! ابلیس تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا تو اُس نے جواب دیا میں ایسا نہیں ہوں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے، سوکھے ہوئے گارے سے بنایا ہے، خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا۔ راندۂ درگاہ ہو، یوم جزا تک تم پہ لعنت ہے''۔

☆☆☆☆☆☆

اس مضمون کو قرآن حکیم میں مختلف جگہ اور مختلف طریقوں سے متعدد بار بیان کیا گیا ہے اِن تمام آیت پر مجموعی نگاہ دوڑانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فلاح کے لیے کون سا راستہ مقرر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا اور اُس کو فرشتوں سے بڑھ کے علم دیا اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی۔ فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب کو سجدہ کرو فرشتوں نے آدم کو سجدہ کر لیا اس طرح ملوکیت انسانیت کے سامنے جھک گئی انسانیت کی فضیلت مسلّم ہوگئی۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور وہ جنوں میں سے تھا اس طرح شیطانی قوتوں نے انسان کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور شیطانی قوتیں انسان کے سامنے سینہ تانے کھڑی ہوگئیں۔ انسان حقیقت میں تو مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اُس میں جو اپنی روح پھونکی تھی اور اُس کو علم میں جو فضیلت بخشی تھی اس بنا پر وہ خلافت خداوندی کا اہل قرار پایا۔ جب کہ شیطان نے اُس کی عظمت کو تسلیم نہ کیا اور اس جرم میں اُس پر لعنت بھیج دی گئی۔ مگر اُس نے قیامت تک مہلت مانگ لی کہ وہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکایا، جنت سے نکلوایا۔ اُسی روز سے انسان اور شیطان کے مابین رزم گاہ سج گئی۔ اللہ رب العزت نے انسان سے کہہ دیا جس نے میرے احکامات مانے، میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کی میں اُسے دوبارہ جنت میں داخل کر دوں گا یہی اسلامی تصورِ فلاح ہے یہی الہامی تصورِ فلاح ہے اور یہی وہ روحانی طرز زیست ہے جن کا تذکرہ اس سطور میں جاری ہے۔ اور جو شیطان کے دھوکے میں آ گیا اور اُس کی پیروی کرنے لگا تو اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور وہ ناکام ہے اور یہی وہ طرز مادیت ہے جس کا شکار آج دنیا کی مہیب آبادیاں ہیں۔

چنانچہ کتاب مبین میں ارشاد ہوا کہ :

فَمَن تَبِعَ ہُدَایَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلاَ ہُمْ یَحْزَنُونَ (38) وَالَّذِینَ کَفَرواْ وَکَذَّبُواْ بِآیَاتِنَا أُولَـئِکَ أَصْحَابُ النَّارِ ہُمْ فِیہَا خَالِدُونَO

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ 2/38-39)

ترجمہ؛

’’تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی ،ایسے لوگوں کے لیے کسی سزا کا خوف اور کسی نامرادی کا رنج نہیں ہے اور جنھوں نے نافرمانی کی اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں اُن کو ہمیشہ رہنا ہے‘‘۔

☆☆☆☆☆☆

سوہ الاحقاف میں ارشاد ہوتا ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَن سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ۔

القرآن الحکیم (سورۃ الاحقاف 16/46)

ترجمہ؛

’’یہ وہ ہیں جن کی خطاؤں کو معاف کر دیا جائے گا اُن کے عمل قبول کر لیے جائیں گے اور انھیں جنتوں میں داخل کر دیا جائے گا‘‘۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ المائدہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنتُم بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ۔

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 12/5)

ترجمہ؛

’’البتہ اگر تم نماز قائم کرو، زکواۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور اُن کی مدد کرو اور اللہ

کا قرض اچھی طرح ادا کرو تو میں تمھارے گناہوں کو تم سے دور کردوں گا اور تم کو ایسی جنت میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ نساء میں فرمایا گیا کہ :

إِن تَجۡتَنِبُواْ كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنكُمۡ سَيِّـَٔاتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُم مُّدۡخَلٗا كَرِيمٗا۔

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 31/5)

ترجمہ:

"تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے اگر تم اُن سے باز رہے اور بری باتوں سے بچتے رہے تو ہم تمھاری خطاؤں کو معاف کردیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے"۔

☆☆☆☆☆☆

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ :

فَمَن تَابَ مِن بَعۡدِ ظُلۡمِهِۦ وَأَصۡلَحَ فَإِنَّ اللّٰهَ يَتُوبُ عَلَيۡهِۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٞ رَّحِيمٌ (39) أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ اللّٰهَ لَهُۥ مُلۡكُ السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضِ يُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ وَيَغۡفِرُ لِمَن يَشَآءُۗ وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٌ O

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 39-40/5)

ترجمہ:

"تو جس نے خود پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کرلی اور خود کو سدھار لیا تو بے شک اللہ اُس کی طرف متوجہ ہوگا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے پاس ہے اور وہ جس کو چاہے معاف کردے جس کو چاہے سزا دے

اس لیے کہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ مریم میں فرمایا گیا کہ :

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئاً ○

القرآن الحکیم (سورۃ مریم 60/19)

ترجمہ؛

"مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور اُن پر ظلم نہ کیا جائے گا"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ فرقان میں ارشاد ہوا کہ :

إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيماً ○

القرآن الحکیم (سورۃ الفرقان 70/25)

ترجمہ؛

"مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ نساء میں ہی مزید ارشاد ہوا کہ :

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ

يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُوْلَـئِكَ يَتُوبُ اللّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّهُ عَلِيماً حَكِيماً (17) وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الآنَ وَلاَ الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ۔

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 17-18/4)

ترجمہ؛

''اللہ اُن کی توبہ ضرور قبول کرتا ہے جو نادانی سے گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں اللہ جن کو معاف کردے گا۔اللہ سب جانتا ہے اور وہ بہت حکمت والا ہے،مگر اُن کی توبہ قبول نہیں کی جاتی جو برے کام کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی یہ تو اُن کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں گے''۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ ہود میں فرمایا کہ :

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُواْ فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ (106) خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ إِلاَّ مَا شَاء رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (107) وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُواْ فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالأَرْضُ إِلاَّ مَا شَاء رَبُّكَ عَطَاء غَيْرَ مَجْذُوذٍ۔

القرآن الحکیم (سورۃ ھود 106-108/11)

ترجمہ؛

''سارے بدبخت دوزخ کی خوارک بنیں گے اور انھیں اس میں گدھوں کی طرح رینگنا ہے اور چلانا ہے جب تک کہ آسمان اور زمین رہیں گے وہ اسی دوزخ میں رہیں گے مگر تیرا رب

جو چاہے کر سکتا ہے اور جو خوش قسمت ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم رہیں مگر جو تیرا رب چاہے اللہ کی بخشش لامحدود ہے"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ بینہ میں فرمایا کہ :

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (6) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (7) جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ (8)

القرآن الحکیم (سورۃ بینہ 89/8-6)

ترجمہ؛

"بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے کفر کیا وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلتے رہیں گے اور یہ بدترین لوگ ہیں۔ بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ بہترین لوگ ہیں اور اُن کی جزا اُن کے رب کے نزدیک بسنے کے وہ باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اُن کا رب اُن سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ تغابن میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (9) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا

بِآيَاتِنَا أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا وَبِئْسَ الْمَصِيرُ O

القرآن الحکیم (سورۃ التغابن 9-10/64)

ترجمہ؛

''اور اُس کو اُن باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے اور جنھوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلا دیا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے''۔

☆☆☆☆☆☆

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی تصورِ فلاح سیدھا اور سہل ہے۔ انسان کو بتا دیا گیا کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے جس طرح کہ اللہ کی لاکھوں کروڑوں دیگر مخلوقات ہیں۔ انسان کو دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز حیثیت سے نوازا گیا ہے۔ اُس کو علم و عقل سے نوازا گیا اور اُسے اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو اللہ کی پیروی کرے اور اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنوار لے چاہے تو اپنے نفس کی پیروی کرے اور شیطان کا مطیع و فرمانبردار بن کر اپنے نفس کا قیدی بن جائے۔ انسان نے اپنے اس اختیار کا اکثر و بیشتر غلط استعمال کیا اور نفس کی آواز پہ ہی کان لگائے اس لیے شیطان انسان کی راہ میں گھات لگائے بیٹھا ہے اور وہ اسے فوری اور سامنے کے منافع کا لالچ دے کر ورغلاتا ہے اور انسان دھوکے میں آ جاتا ہے۔ یاد رہے اکثر و بیشتر مذاہب میں موت کے بعد حیات کا تصور موجود ہے جزا اور سزا کا تصور بھی موجود ہے، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں تک میں بعد موت از حیات کا تصور موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اِن مذاہب کے پیروکار نہ تو اپنے ادیان کے بارے میں سنجیدہ ہیں اور نہ ہی انھیں اس بات کی کوئی خاص پرواہ ہے کہ موت کے بعد اُن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اسلام نے آخرت کے تصور کو نہایت واضح اور بین دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور انسان کے سامنے اس امر کو کھول دیا ہے کہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہی ہے۔ اس دنیا میں جیسے کیسے وقت گزرے مگر اللہ کی اطاعت کے ساتھ گزرے تو انسان کامیاب ہو گیا۔ دوسری صورت میں یہ

زندگی چاہے اُس کے لیے کس قدر آسان ہو، اُس کے پاس دولت کے کتنے ہی انبار ہوں چاہے اُس کی جائیدادوں کو گنا نہ جاسکے اللہ کو اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں اللہ کے نزدیک اگر کوئی چیز وزن رکھتی ہے تو وہ صرف تقویٰ ہے۔انسان کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے، سعی اور کوشش کی جگہ ہے، احتیاط اور نرمی کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رہنے بسنے کے آداب شرح و بست کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں ، رشتے داروں کے حقوق ، پڑوسی کے حقوق غریبوں مسکینوں کے حقوق، بے سہارا اور مجبوروں کے حقوق، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق الغرض حقوق العباد کا ایک پورا نظام ہے جو وضع کر دیا گیا اور اللہ کے احکامات میں اِن کی بہت اہمیت ہے۔اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بتایا کہ یہ زندگی مختصر ہے، اِس کو اِس طرح گزارو کہ خود کو اللہ کی نافرمانی سے محفوظ رکھ سکو اور آخرت دار الجزا ہے نیکی اور بدی اچھے اور برے عمل کے پھل کی جگہ ہے۔انسان کو موت کی گھڑی تک مہلت ہے جونہی سانس رکی مہلت عمل ختم ہو گئی اور انسان یا بدقسمتوں میں جا شامل ہوا یا خوش قسمتوں کا ساتھی بن گیا۔

بدقسمتوں میں اکثریت اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے اللہ کا انکار کیا۔اُس کی رحمت سے منہ موڑا ہے ،اپنی خطاؤں کی معافی نہیں مانگی ۔اپنی زندگی میں ایک نگاہ دوڑائیں ، اپنے ارد گرد دیکھیں بازاروں گلیوں اور شاہراہوں پہ نگاہ کریں۔اپنے گھر میں جھانکیں اور اس بات پہ غور کریں کہ ایک مسلمان کا گھر ہونے کے باوجود فکرِ آخرت کا معیار کیا ہے، حیَّ الفلاح حیَّ الفلاح کی آواز پر آپ کے بچے بستر چھوڑ دیتے ہیں، اللہ و اکبر کی آواز سے لوگ مسجد کی طرف جاتے ہیں یا ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔صبح کو قرآن حکیم کی تلاوت کی جاتی ہے یا اُسے ریشمی غلاف میں لپیٹ کر بچوں کی پہنچ سے دور اوپر کی الماری میں رکھ دیا گیا ہے اور صرف رمضان کو ہی اتارا جاتا ہے۔اپنے عقیدے کی اصلاح کے لیے قرآن و حدیث سے دلچسپی ہے یا سارا وقت دوکان یا دفتر کی نظر ہو جاتا ہے۔آپ کے رشتے دار آپ سے راضی ہیں یا اُن کو آپ کی ذات سے گلہ ہے، آپ کے والدین آپ کو دعائیں دیتے ہیں، گزرتے وقت کا احساس، موت کی آتی چاپ اور روزِ محشر کی تیاری کے سلسلے میں تنہائی میں کبھی غور کیا ہے یا نہیں ۔یہ اور اس جیسے چند سوالات خود سے کرنے پر انسان جان جاتا ہے کہ وہ اُس عظیم الشان دن کو سرخسرو ہو گا یا شرمندہ ہو گا۔اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم

فرمائے اور ہمیں روزِ محشر کی شرمندگی سے بچائے۔ یاد رہے کہ روزِ محشر کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے اور یہی اسلام کا تصورِ فلاح ہے یہی روحانی طرزِ زیست ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ :

قُلْ إِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانعام 6/162)

ترجمہ؛

”کہو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری زندگی اور میری موت سب خدا کے لیے ہے جو رب العالمین ہے“۔

☆☆☆☆☆☆

اس ساری بحث سے یہ حاصل ہوا کہ ہم نے روحانی طرزِ زیست کے مبادیات کو جانا اس کے تقاضوں سے واقفیت حاصل کی، سرکائنات انسان کے مقام کو سمجھا اور خالق سے اس کے تعلق کو جاننے کی کوشش کی اور اس بات پر یقین فراہم کیا کہ وہ طرزِ زیست جسے خالق نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے وہی انسان کو کائنات میں اس کے اصل اور متعین مقام پر قائم رکھنے مدد و معاون ہے اور اس کے سوا باقی تمام رستے جاہلیت اور گمراہی کے رستے ہیں چاہے انھیں دنیا کی کثیر تعداد نے اپنا رکھا ہو، چاہے انھوں نے مادیت کے زور پر اپنے معاشروں میں کتنی ہی مصنوعی چمک دمک پیدا کر رکھی بہرحال وہ بے منزل مسافرت کے آزار میں ہیں اللہ سب انسانوں کی راہنمائی فرمائے۔

آمین

مادیت ، آج اور کل

دور دور جہاں تک نظر جاتی ہے انسان گمراہی اور جاہلیت کی پناہ میں ہے۔ وہ ایسا مسافر معلوم ہوتا ہے جو صحرا میں رستہ بھول چکا ہو اور اب سراب اُسے منزل سے برگشتہ کرنے کے درپے ہوں۔ خطہ ارض پہ بسنے والے کئی ارب لوگ تو خدا کے وجود سے بھی انکاری ہیں۔ رہے وہ لوگ جو خدا کے وجود کے قائل ہیں تو اُن کی بھی بہت بڑی اکثریت خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتی ہے۔ زندگی کی مقصدیت قابل غور امر نہیں رہی، زندگی کی تعیش کے لیے زندگیاں اجیرن ہو کے رہ گئی ہیں۔ فکر و عمل کے بگاڑ نے انسانی معاشروں میں ہمہ پہلو اور ہمہ گیر جہالت کو جنم دیا ہے مگر حیرت تو اس بات پہ ہے کہ لوگ اپنے اس سرمائے پہ نازاں ہیں۔ دنیا کے بہت سے معاشرے اخلاقی، عملی، فکری، معاشی، سماجی اور سیاسی بگاڑ کا شکار ہیں۔ تاریخی تناظر میں اس ہمہ گیر جاہلیت کا جائزہ لیں تو دو امور سر فہرست نظر آتے اول اللہ تعالیٰ کی ذات سے انکار دوم اللہ تعالیٰ کے احکامات سے انکار۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس دور کے علماء نے اس تخیل کو علمی اور سائنسی دلائل فراہم کر دیئے ہیں جس سے جاہلیت کو علمی پشت پناہی بھی حاصل ہو گئی۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ آج کا شر، آج کی

جاہلیت، آج کی گمراہی گزرے کل سے زیادہ شدید ہے۔ اس جاہلیت کا عظیم ترین فتنہ یہ ہے کہ اس کی تائید کے لیے بے پناہ علم اور لامحدود مادی وسائل موجود ہیں۔ آج باطل نے علم کا سہارا لے لیا ہے اور علم ہی کو گمراہی کا ذریعہ بنالیا ہے۔ جدید نشریاتی نظام، ذرائع ابلاغ کے ادغام، نظریات کی ہمہ پہلو تشریحات اور خدا سے باغی اصحابِ دانش کی بے پناہ تاویلوں نے حق اور باطل کو باہم مدغم کر کے رکھ دیا ہے اور ایک قلب سلیم رکھنے والے شخص کے لیے حق تک پہنچنا دشوار بنادیا گیا ہے۔

آج صرف دولت ہی کی کثرت نہیں بلکہ مہلک اسلحہ کی بھی کثرت ہے۔ یادر ہے کہ انسانی معاشرے خواہ کتنے ہی فساد کا شکار کیوں نہ ہوجائیں لیکن اِن میں تمام کا تمام شر غالب نہیں ہوسکتا کہ خیر کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ اگر چہ انفرادی طور پر ایسا ہونا ممکن ہے کہ کوئی شخص نفس کی قید میں اس قدر ملوث ہوجائے کہ وہ سراپا شر بن کے رہ جائے اور اس سے خیر کی توقع بھی باقی نہ رہے۔ تاہم کوئی معاشرہ پورے کا پورا شر کا شکار نہیں ہوتا اور اسی لیے اہلِ مغرب کی شدید جہالت کے باوجود اُن کو کچھ تہذیبی اور مادی سہولتیں مہیا ہوگئیں ہیں جو اپنی ظاہری شکل میں بہت پرکشش دکھائی دیتی ہیں۔ اُن کو بعض پہلوؤں میں دیگر اقوام سے برتری حاصل ہوگئی ہے یعنی طب، عسکریات، معاشیات کے میدانوں میں وہ دوسرے لوگوں سے آگے ہیں مگر یہ برتری انھیں اللہ سے انکار کی قیمت پر حاصل ہوئی ہے اور یہ بہت بڑی قیمت ہے اگر کوئی جانے تو؟؟؟

یورپ میں جب صنعتی انقلاب آیا تو اُن کے صاحب علم نے اُن کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ صنعتی پیداوار نہیں کرتا بلکہ انسان کرتا ہے۔ چونکہ انسان نے اپنے علم کی بنا پر مادے کے خواص معلوم کیے ہیں اور خود ہی وہ مشینیں بنائی ہیں جن سے وہ صنعتی پیداوار حاصل کرتا ہے انسان ہی مشین کو حرکت دیتا ہے اور انسان ہی کے اشارے پر مشین رُک جاتی ہے انسان ہی خام مال کو تلاش کرتا ہے اور وہی خام مال سے پیداواری مصنوعات حاصل کرتا ہے اور جب یہ سارے کام انسان خود ہی کرتا ہے تو وہ خدا کی بجائے صنعت کی پرستش کیوں نہ کرے۔ چنانچہ لوگوں کی اکثریت جو پہلے کلیسا اور جاگیردار کی غلامی میں تھی اب وہ صنعت اور صنعت کار کی غلامی میں آگئی۔ رفتہ رفتہ کلیسا کا اثر کم ہوتا گیا اور لوگ محض مادیت کے پجاری بن کے رہ گئے اس سے اگلے مرحلے میں جب انھیں مادی آسائش حاصل ہوگئی تب وہ نفس کے پجاری بن کے رہ گئے۔ روحانیت کم ہوتی چلی گئی اور مادیت اُن کا واحد معبود بن

کے رہ گئی۔ جب وہ روحانیت سے یکسر عاری ہوئے تو انھوں نے طبیعت (Nature) کے دامن میں پناہ لی۔ رفتہ رفتہ طبیعت نے اللہ کی جگہ لے لی۔ یہ دراصل فلسفے کا الجھاوا تھا جس میں لوگوں کو اس لیے دلکشی نظر آئی کہ وہ کلیسا کے جبر سے اکتائے ہوئے تھے۔ کلیسا نے اُن پہ اس قدر تاوان مقرر کر رکھا تھا جسے ادا کرنا اُن کے لیے نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ جب اُن کو فرار کے لیے کوئی سوراخ نظر آیا تو وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ اس لیے بھی کہ طبیعت کے نام پر جو نیا الہٰ تراشا گیا تھا اس کا نہ کوئی کلیسا تھا اور نہ ہی اس کے حقوق و فرائض تھے اور ساتھ ہی یہ لوگوں کے جذبہ عبودیت کی تسکین بھی کرتا تھا۔

وہ ہر حال میں کلیسا کے اُس جبر سے جان چھڑانا چاہتے تھے جو کئی صدیوں سے اُن پہ مسلط تھا اور وہ اُس کی روحانی برکات سے بھی مایوسی کا شکار ہو چکے تھے۔ یہ یورپ کا درمیانی دور تھا جب طبیعت کے دیوتا کی پوجا ہو رہی تھی۔ اس زمانے کے لوگوں کے دلوں میں اللہ کا تصور موجود تھا جسے وہ اپنی خلوت میں پکارتے تھے۔ کلیسا میں بھی اللہ ہی کی عبادت ہوتی تھی اور وہ کسی حد تک اپنے مذہب اور اخلاقی روایات کے بھی پابند تھے تاہم یہ سب کچھ بطور عادت کے تھا عبادت کے نہ تھا اور نہ ہی اس کے پس پشت کوئی ایمانی قوت تھی۔ اسی طرح اُن کے ہاں الہٰ کا تصور ماند پڑتا رہا بلکہ چند در چند ہوتا رہا۔ اُن کے درمیان پیچیدگیاں بڑھتی رہیں، چنانچہ اُن کے ہاں جب کلیسا میں نماز پڑھی جاتی تو اللہ کی ذات کو محبوب سمجھا جاتا اور اسی سے ڈرا جاتا۔ تاہم جب فنی شعور کا معاملہ ہوتا تو طبیعت سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ کیونکہ تحریک رومانویت نے اُن کے ہاں طبیعت (Natureizm) کو بڑی اہمیت دے دی تھی اور اُن کے شعرا نے اس کا عمدہ منظر باندھا تھا۔ علاوہ ازیں اُن کے ہاں علمی ترقیات میں بھی طبیعت ہی کو مرکزی مقام حاصل ہو رہا تھا اس لیے کہ تب سائنس دانوں نے وہ قوانین طبیعت معلوم کر لیے تھے جن کی بنا پہ کائنات کی علمی توجیح ممکن ہوئی۔ چنانچہ تب کلیسا کی شکست کی بنا پڑ گئی تھی اس لیے کہ وہ اِن علمی حقائق کو مسترد کرنے کے قابل ہرگز نہ تھے۔ جبکہ سو سال قبل ہی وہ کسی نئی علمی توجیح کے عالم کو قتل کر دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے مگر اب معاشرے پہ کلیسا کی گرفت اس قدر مہیب نہ تھی کہ وہ نئے اور ابھرتے ہوئے علمی نظریات کو رد کر سکے۔ چنانچہ تب عوام تین الہٰوں میں منقسم ہو گئے اور طبیعت اُن کا تیسرا الہٰ قرار پایا جب کہ

قرونِ وسطیٰ میں اُن کے دو ہی الٰہ تھے کلیسا یعنی کہ عقیدہ اور قانون یعنی کہ بادشاہ۔مگر اب طبیعت (Nature) اُن کا تیسرا خدا تھا۔تغیر کا عمل جاری رہا اور یورپ میں صنعتی دور کا آغاز ہو نے لگا تھا تب طبیعت کی ساحری رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اس لیے کہ الوہیت رفتہ رفتہ اُن میں دم توڑ رہی تھی۔دوسری طرف فنی نقطہ نگاہ سے بھی طبیعت مرکز خیال نہ رہی تھی بلکہ عملی زندگی میں اب انسان کسی بھی الٰہ کو پوجنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا اس لیے کہ صنعتی زندگی نے جہاں اُس کے شب و روز بدلے تھیں وہیں علمی نقطہ نگاہ سے انسان نے طبیعت کے رازوں کا پردہ بھی چاک کر دیا تھا اور خود طبیعت پر اُس کی بالادستی قائم ہو چکی تھی۔چنانچہ مغرب کے ہاں الوہیت اللہ سے طبیعت میں منتقل ہوئی اور طبیعت سے رومانویت میں اور رومانویت کے بعد صنعتی تسلسل نے انسان کو کسی بھی خدا سے بے نیاز کر دیا۔اہل سائنس اور جدیدیت کے علمبردار علماء نے بھی لوگوں کے اس تخیل کی پشت پناہی کی اور لوگوں کو اس امر کی طرف مائل کیا کہ کسی غیبی طاقت کسی اَن دیکھی قوت کے سامنے سر جھکانا انسان کے لیے عزت کی بجائے ذلت کی بات ہے اور انسانیت کے لیے ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنے افکار اور اپنے اخلاق کا مرجع کسی ایسی ہستی کو بنائے جسے نہ وہ دیکھ سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے ۔بھلا کب تک انسان اندھا بن کر اِن بے حقیقت اساطیری قوانین پر چلتا رہے؟ چنانچہ انسان مذہب کی گرفت یا دوسرے لفظوں میں کلیسا کی گرفت سے آزاد ہوتا چلا گیا اور یہ اس کے دل کی خواہش بھی تھی۔اُس نے اُن معبودوں کی پرستش بھی چھوڑ دی جن کی پرستش وہ جاہلیت یعنی مذہب کے عہد میں کرتا تھا۔

تب اصول عبادت اور اللہ تعالیٰ پہ ایمان لانے کو دقیانوسی قرار دے دیا گیا،عقلیت پسند جیت گئے اور اب ہر چیز کو چاہے وہ عقیدہ ہو یا روحانیت عقل کی کسوٹی پہ پرکھا جانے لگا۔جو بات عقل کی گرفت نہ آئے اُسے افسانہ قرار دے دیا گیا اور خدا کے وجود کا عقل کیا سراغ لگاتی۔چنانچہ خدا کا وجود بھی اُن کے گزرے کل کی طرح اُن کی عملی اور اعتقادی زندگی سے تحلیل ہو گیا۔اس لیے انسان نے خود ہی اپنی زندگی کی تعمیر شروع کر دی اور قانون سازی کا حق بھی خالق سے خود انسان ہی کو منتقل ہو گیا۔ اُس دور کے علماء کا خیال تھا کہ چونکہ انسان لحظہ بہ لحظہ اپنی بدلتی ہوئی ضروریات سے خالق سے بھی زیادہ آگاہ ہے اس لیے اُسے خود ہی اپنے لیے قانون بنانا چاہیے۔جب اس بگاڑ میں مزید اضافہ ہوا

تو وہ اپنے ساتھ انسان کی عبادت کو بھی بہا کے لے گیا۔ بگاڑ کو اس نہج تک لے جانے میں رومی اور یونانی فکر کا بہت عمل دخل تھا۔ یونانی فکر و فلسفہ میں خالق کا قد بہت نیچا ہے اور عقل کی پہنچ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ چنانچہ یونانیوں کا الٰہ انسانوں ہی کی طرح کا رویہ اختیار کرتا ہے اور انسانوں سے جنگ بھی کرتا ہے جس میں بیشتر اوقات عقل کے ذریعے انسان ہی غالب رہا ہے۔ چنانچہ رومی الہامیات میں انسان اور خدا کے مابین نفرت کی خلیج حائل ہے اور لوگ اپنے معبود سے محبت کی بجائے نفرت کرتے ہیں اور اُس پہ غلبہ حاصل کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ رومی جاہلیت کا یہ قدیمی خیال کہ جو کچھ حواس خمسہ کے ذریعے محسوس ہو سکے وہی حقیقت ہے باقی سب فسانہ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو حواس خمسہ کے ذریعے سے محسوس نہیں کیا جا سکتا اس لیے خدا پہ ایمان لانا بھی ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ رومی جاہلیت نے عقل کو بڑھاوا دیا اور انسانی عقل کو اس قدر بلند کر دیا کہ وہ بلا تکلف خالق کے معاملات میں بھی دخیل ہو سکتی ہے۔

اہل مغرب نے عقل کو اس حد تک چھوٹ دے دی کہ وہ خالق کے وجود پر بھی تنقید کرنے لگے جس سے اہل مذہب اور عقلیت پسندوں میں ایک کشمکش وجود میں آ گئی، نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور میں تو یہ کشمکش کھلم کھلا جاری تھی کہ جاہل اور کمزور آدمی تو خدا کے سامنے جھکتا تھا مگر جب وہ علم و طاقت حاصل کر لیتا تو اُس کا رتبہ اور مقام خدا سے بھی بڑھ جاتا۔ چنانچہ جوں جوں اہل عقل میں اضافہ ہوتا رہا اور وہ علمی انکشافات سے لوگوں کو مسحور کرتے رہے تب تب خدا کے وجود کی دلیل کم سے کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انسان کسی خالق کی ضرورت سے بے نیاز ہو گیا۔

عقل نے انسان کو ہی انسان کا معبود بنا دیا تب انسان اور انسان کے مابین ایک کشمکش شروع ہو گئی کہ ایک طرف انسان عابد تھا جو کسی معبود کے وجود کی ضرورت محسوس کرتا تھا تو دوسری طرف انسان معبود تھا جس کو اپنی عقل پہ ناز تھا اور وہ اپنی عقل کی شکست تسلیم کرنے کو کسی طور تیار نہ تھا۔ پھر یہ کشمکش پھیل گئی، فرد کی جماعت کے ساتھ، فرد کی معاشرے کے ساتھ، فرد کی اقدار کے ساتھ اور پھر فرد کی دوسرے فرد کے ساتھ کشمکش بپا ہو گئی اور اس روحانی انارکی نے انسان کی عبادت کا خاتمہ کر دیا اُسے خالق کے وجود سے دور کر دیا۔ اُس معاشرے میں معبودوں کی تعداد بڑھتی رہی پوجا کے لیے نہیں بلکہ عقل کی تسکین اور فتح کے لیے۔ چنانچہ علمی مباحث سے کئی مزید معبود نمودار ہوئے اور انسان

اقتصادی، اجتماعی اور تاریخی جبریتوں کو حاکم تسلیم کرتا چلا گیا۔اس سارے فساد اور شر کی طویل داستان کے آخر میں انسان نے مادیت کے سامنے شکست تسلیم کر لی اور وہ مذہب سے بہت دور ہٹ گیا۔اول اول اُس نے صرف تقدیر سے انکار کیا۔تقدیر پہ انسان کی بالادستی کا قائل ہوا اس کے بعد وہ صنعتی عہد میں داخل ہوا جس کے آخر میں وہ مادہ پرستی کا اسیر ہو کے رہ گیا۔اور یہ وہ شر ہے جس نے آج کی دنیا میں بیشتر آبادیوں کو لپیٹ میں لے لیا ہے اور دور دور تک مادیت پرستوں کا راج نظر آتا ہے۔مادیت کے اس دستور نے انسانیت کو بھیانک نتائج تک پہنچایا۔مادی زندگی میں نتائج کا طریقہ کار ہی زندگی کی اجتماعی، سیاسی اور معنوی شکلیں متعین کرتا ہے۔انسانی شعور کو متعین نہیں کرتا بلکہ یہ شکلیں انسانی شعور کا رخ متعین کرتی ہیں۔جبریتوں کا دیوتا مادیت انسان کے فکر و تخیل اور اُن کے حق و انصاف کی طرف سبقت کی فطری صلاحیت کا خیال کیے بغیر اُن کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔

یہ ایسا دیوتا ہے جو انسانوں کے ضمیر کی آواز پر لبیک نہیں کہتا اور نہ اُن کے نفس کے ساتھ چلتا ہے۔ جیسا کہ اللہ انسان کے ضمیر کی آواز کو سنتا ہے اور نفس انسانی کی رعایت کرتا ہے۔خالق انسان پر بے جا بوجھ نہیں ڈالتا مگر مادی جبریت انسان کو کشمکش اور مسابقت کی وحشت کے حوالے کر دیتی ہے۔مادہ پرست معاشروں میں اخلاقی اور عقائدی تنزلی کے پس منظر میں خواہش کی نہ ختم ہونے والی اشتہا ہے جس نے لوگوں کے انبوہ کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔یاد رہے کہ اس سارے تنزل کے پس منظر میں نہ تو کوئی عقلی منطق ہے اور نہ کوئی بصیرت، نہ ہی کوئی سند، کیونکہ جب اللہ کے ساتھ شرک کے بگاڑ کی ابتداء ہوئی تو اُس کے لیے بھی لوگوں کے پاس نہ تو کوئی منطقی استدلال تھا نہ کوئی بصیرت نہ کوئی تائید ۔اس لیے جو شخص یا جو معاشرہ اللہ کی حقیقت سے واقف ہو وہ کبھی شرک کی راہ پہ نہیں چلتا۔بیان کیا گیا ہے کہ جب یورپ میں نصرانیت داخل ہوئی تو کانسٹائن کے ہاتھوں اُس میں رومی ثنویت کی آمیزش ہو چکی تھی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ نے اللہ کی حقیقت کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔چنانچہ اُن کی جاہلیت میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا رہا۔بعض مورخین کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کردہ شریعت چونکہ رومی سلطنت کے مختصر حصے میں ظہور پذیر ہوئی تھی اس لیے اتنی وسیع سلطنت میں اس کا نفاذ ممکن نہ ہو سکا۔یہ حقیقت ایک عذر سے پردہ تو اٹھاتی ہے لیکن یہاں

اس حقیقت سے غفلت برتی گئی کہ مسیحی تصور میں عقیدہ خود بھی صحیح نہ تھا اس لیے کہ اگر عقیدہ صحیح ہوتا تو رومی سلطنت اُس کا راستہ نہ روک سکتی جیسا کہ اسلام کا عقیدہ درست تھا اس لیے اسلام کے سامنے نہ عرب کی اندرونی طاقتیں زیادہ دیر تک ٹھہر سکیں اور نہ بیرونی طاقتیں اسلام کا راستہ روک سکیں۔ جب کہ بیرونی طاقتوں میں خود روم اور ایران کی عظیم الشان مملکتیں بھی شامل تھیں۔ بہر حال یہ ایسے اسباب ہیں کہ ان سے واقعات کی تشریح تو کی جا سکتی ہے مگر اِن سے راہ حق سے انحراف کا جواز فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ اصل میں مسیحیت کے عقیدے میں پیدا کردہ تحریف ہی اصل بگاڑ کا باعث بنی۔ چنانچہ اُن کے نفس نے شرک کی غلاظت کو قبول کر لیا تو اس کے بعد تمام تر اخلاقی تنزل اُن کے لیے آسان ہو گیا۔ یورپ میں دین کی ابتداء ہی غلط ہوئی اس لیے اہل یورپ رفتہ رفتہ خدا سے دور ہی ہوتے رہے اور آج اُن کی خالق سے دوری اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ جب کلیسا نے اپنی حماقتوں سے برائیوں اور خرابیوں میں اضافہ کر دیا تو یہ اہل یورپ کے عقیدے میں مزید بگاڑ کا باعث بنا۔ جس نے بتدریج اس بگاڑ کو بیسویں صدی کے عظیم شر سے جا ملایا۔ جس نے لوگوں سے اُن کے خدا کو چھین لیا اور اُس کے دل میں آرزوؤں اور خواہشوں کا ایسا الاؤ جلا دیا جس کو بجھانے میں ہی اُن کی عمر گزر جاتی ہے اور وہ خیر کی تلاش کی مائل ہی نہیں ہوتے کہ اُن کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ جان سکیں کہ خیر کیا ہے شر کیا ہے؟؟؟

مادیت اور اھل فلسفہ

قدیم زمانے میں انسان کے ذہن پر فلسفے کا غلبہ تھا، علم فلسفہ چیزوں کو مکمل طور پہ سمجھنے پر زور دیتا ہے۔ وہ اشیاء کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن تک پہنچنا چاہتا ہے۔ تاہم پانچ ہزار سالہ انسانی کوششوں کے باوجود فلسفہ کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ فلسفہ نے کائنات اور زندگی کی جو تشریحات کیں اگرچہ ایک زمانے تک لوگوں میں مقبول رہیں تاہم خود اہل فلسفہ اور ان کے نظریات زمانے کے ارتقاء کا شکار رہے۔ اس لیے کوئی فلسفہ کائنات اور زندگی کی حتمی تشریح تک نہ پہنچ سکا۔ مگر جب خالق نے اپنے علم سے انسان کی راہنمائی فرمائی تو انسان نے نہ صرف مقصدِ زیست کو جانا بلکہ زندگی کے پس منظر میں پھیلے ان تمام مظاہر کائنات کے حقیقی تصور تک بھی اس کو رسائی حاصل ہوگئی جو صدیوں تک انسان کے لیے ایک لایعنی دردسر کا باعث بنے رہے۔ فلسفے کے قبول و رواج کے ساتھ انسان نے توہم کے اس چنگل سے نجات پائی جسے وہ مذہب کہتا چلا آیا تھا۔ جب مظاہر کائنات کی فلسفیانہ تشریحات سامنے آنے لگیں تو انسان نے بھی ان کو معبود ماننا چھوڑ دیا اگرچہ حقیقی معبود تک رسائی ابھی اس کی پہنچ سے ذرا پرے تھی مگر اس

نے اپنے سماجی اور تمدنی رویوں میں تبدیلی کا کافی سفر طے کیا جس نے اس کے تصورِ معبود کو بھی متاثر کیا اور قدیم عقائد جیسے روحوں کا مت وغیرہ کے اثرات بتدریج کم ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ مادیت پسندی کی لہر اور سائنسی دور کی ابتدا کے ساتھ بالکل ہی ناپید ہو گئے۔ سائنس اور مادیت پسندی میں شروع ہی سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور یہ جدیدیت کے حامی تصورات پر مبنی رہے ہیں اور ان کی رو سے عالم کو حقیقی مانا گیا ہے۔ سائنس میں مشاہدے اور تجربے سے کام لے کر ان کی روشنی میں نظریات مرتب کیے جاتے ہیں اور مادیت پسندی میں حسیات اور مدرقات کے وسیلے سے تجریدات اور معقولات اخذ کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ مثالیت پسندوں نے حقیقت کبریٰ کو وجودِ متعلق یا شعورِ متعلق یا عین العیون کو جو اِن کی فکری کاوشوں کا حقیقی مقصود منتہا ہے خدا کا نام دیا ہے مگر مثالیت پسندوں کے وجودِ متعلق یا خدا اور اہل مذہب کے خدا میں یہ فرق ہے کہ مثالیت پسندوں کا وجودِ متعلق یا خدا واجب الوجود ہے اور شخصی ہے جب کہ اہل مذہب کا خدا ایک ذی ارادہ ہستی ہے جو انسان ہی کی طرح جذبات و احساسات رکھتا ہے اور کائنات میں ہر وقت ہر قسم کا تصرف کرنے پر قادر ہے۔ مزید براں مثالیت پسند بھی اہل مذہب کی طرح روح اور اس کی بقاء کے قائل ہیں اور انسان کو فاعل مختار مانتے ہیں۔

فلاسفہ کا مذہبی تصور یہ رہا ہے کہ عہد قدیم کے عقائد جادو دیو مالا اور دیگر مذہبی تصورات روحوں کے مت سے ماخوذ ہیں (۵)۔ جادو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ انسان کی زندگی پر چند نیک یا بد ارواح کا تسلط ہے چنانچہ جادوگر اپنی نیک روحوں سے کام لے کر انسان کو بد روحوں کے آزار سے محفوظ کرتے اور خبیث روحوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے دشمنوں کی ایذا رسانی کے لیے استعمال کرتے۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ مظاہر کائنات یعنی سورج، چاند، ستاروں دھرتی وغیرہ کی پوجا بھی شروع ہو گئی مگر ان کی پوجا اس نظریے کے تحت کی جاتی کہ وہ روشنی، حیات، زرخیزی اور افزائش کے پاسبان تھے علاوہ ازیں ان کے ہاں موت، تاریکی، گرہن، رعد، زلزلے، آتش فشاں اور پہاڑوں وغیرہ کے خوفناک دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی قربانی دی جاتی تا کہ وہ ان کے درپئے آزار نہ ہوں۔ چنانچہ اہل فلسفہ مانتے ہیں کہ مذہب روحوں کے مت ہی کی منظم صورت ہے جس میں انسان نے زندگی کے مصائب و حوادث، موت اور امراض کی دہشت اور اس بے کراں کائنات میں اپنی بے چارگی اور بے بسی کے تلخ احساس سے پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک یا ایک سے زائد فوق الطبع ہستیوں کا

سہارا لیا۔اب ہم مذہب اور مثالیت پسندی کے مابین باہمی تعلق کے بارے میں بحث کریں گے جس پہ مذہبی فلسفے کی بنا رکھی ہے۔مذہب اور مثالیت پسندی کے باہم ربط کے بارے میں مشہور جرمن فلاسفر (Foair Bagh) لکھتے ہیں کہ مذہب اور مثالیت پسندی دونوں ایک ہی فکری رویے کے مختلف پہلو ہیں۔ان کے مطابق مثالیت پسندی نے شروع ہی سے مذہب کے دامن میں پرورش پائی تھی اس لیے مذہب کے ساتھ ہمیشہ اس کا گہرا ربط وضبط قائم رہا ہے۔فوئر باخ کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ مذہب اور مثالیت پسندی کے مہمات مسائل میں گہری فکری یگانگت پائی جاتی ہے۔تاہم اس بارے میں طالیس اور اس کے پیروؤں کا نقطہ نظر علمی و تحقیقی تھا اور وہ ذاتی مشاہدہ کو اہم سمجھتے تھے جس سے فلسفے میں مادیت پسندی کا رجحان پیدا ہوا۔اس کے برعکس مثالیت پسندی میں ''پیروالونیسس مَت'' کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں یہ مت تھریس سے نکل کر یونان میں پھیلا تھا۔وہ شراب کے نشے اور بے خودی کا دیوتا مانا جاتا تھا۔

اس کے پیروؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ شراب پینے سے انسان کے دل و دماغ میں از خود رفتگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دیوتا والونیسس انسان کے بطون میں حلول کر جاتا ہے۔مستی اور بے خودی کے اس مت کی اشاعت میں ایک نیم افسانوی شخصیت عارفیوس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس سے اس کا نام عارفی مت پڑ گیا۔عارفیوس ایک باکمال گوّیہ تھا جو ایک روایت کے مطابق اپنی بیوی کی تلاش میں زمین دوز مملکت کو بھی گیا تھا،جسے نشے میں دھت چند عورتوں نے چیر پھاڑ کر قتل کر دیا تھا،عارفی مت کے خاص تہوار پر ان کی عورتیں اور مرد نشے کی حالت میں دیوانہ وار ناچتے گاتے ہوئے جلوس نکالا کرتے اور اس عالم میں جو بھی حیوان ان کے راستے میں آ جاتا اس پر جھپٹ پڑتے اور اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔ مشہور فلسفی اور ریاضیات کا عالم فیثا غورث بھی عارفی مت کا ایک مصلح تھا (۶)۔جس کی تعلیمات کی اشاعت سے اس کے خیالات عارفی مت کے رسوم و شعائر مثالیت میں بھی رواج پا گئے مثالیت پسندی کا مشہور شارح افلاطون بھی فیثا غورث کے افکار سے متاثر تھا۔

باطنیت (Esotericism) کی روایات اور تراکیب بھی فیثا غورث سے یادگار ہیں کیونکہ وہ اپنے طلبہ اور طالبات کو ان امور کی خفیہ تعلیم و تلقین کیا کرتا ان باطنی افکار کا حاصل یہ تھا کہ ہم سب اس دنیا میں اجنبی ہیں اور روح بدن کا زندان ہے۔فلسفیانہ تفکر و تعمق سے روح کو مادی علائق سے نجات دلائی جا سکتی

ہے۔روح کو مادی دنیا سے نجات دلانا ہی فلسفے کا حقیقی منصب اور زندگی کا اصل مقصد ہے۔فیثا غورث اور اس کے پیرو تنسخ ارواح پر محکم عقیدہ رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس دنیا میں ہم سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں انھی کی رعایت سے موت کے بعد ہمیں نیا قالب ملتا ہے۔لفظ ''فلسفی'' ایک اصطلاح ہے جس کا لغوی معنٰی ہے دانش دوست، اور یہ ترکیب فیثا غورث ہی کی وضع کی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ فیثا غورث نے اعداد کا تصور پیش کیا اور کہا کہ یہ عالم طاق اور جفت اعداد سے بنا ہے اور یہ اعداد قائم بلذات ہیں اور ہر شئے کی اساس بھی یہی اعداد ہیں۔ بعد میں افلاطون نے فیثا غورث کے اعداد اور سقراط کے تجریدات (Concepts) کی طرح اپنے امثال کو بھی ازلی و ابدی قرار دے دیا۔افلاطون کے فلسفے میں اشراق، سِرّیت ، مذہب، باطنیت اور عقلیت پسندی کے عناصر اکٹھے ہو گئے اس کا فلسفہ ایک خوبصورت قالین کی طرح ہے جس کی بنوٹ میں مختلف رنگوں کے دھاگے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود افلاطونی فلسفے کا خاص نقش بھی اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھے ہوئے ہے۔ فیثا غورث، پارمی نائدس، ہیریکلیتس اور سقراط کے فلسفیانہ افکار کا مجموعی عکس افلاطون کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔پارمی نائدس واحدت الوجود کا شارح تھا۔اوائل عمری میں وہ فیثا غورث کا پیرو رہ چکا تھا اس کے فلسفے کو الیاطی وجودیت کا نام دیا گیا کیونکہ وہ ایلیا کی ریاست کا شہری تھا۔اس کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں میں زینو اور زینوفینس قابل ذکر ہیں۔مورخین کے خیال میں الیاطی وجودیت پہلا حقیقی فلسفہ ہے اور ایک مستقل نظام فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔اس فلسفے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ صرف وجود ہے اور ناوجود کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم اس کے عدم وجود کی وجہ سے کوئی بھی فکری تصور پیش نہیں کر سکتے۔ پارمی نائدس کا وجود واحدِ ساکن ہے۔دنیا میں جو کچھ بھی حرکت و تغیر ہے وہ ہماری نظر کا فریب ہے۔پارمی نائدس نے سب سے پہلے عقلی استدلال اور حسیات میں تفریق کی اور کہا کہ کثرت کی دنیا حواس کی دنیا ہے جو غیر حقیقی ہے۔حقیقی دنیا صرف عقل و استدلال کے ذریعے ہی دریافت کی جاسکتی ہے۔عالم ظواہر اور عالم حقیقی یا عالم استدلالی کی یہ تفریق ہی مثالیت پسندی کی سنگ بنیاد بن گئی۔مثالیت پسندوں کا اصل اصول یہی ہے کہ ''صداقت عقل استدلالی میں ہے حواس میں نہیں'' مادیت پسند کہتے ہیں کہ حواس کا عالم یا عالمِ ظواہر ہی حقیقی ہے جبکہ مثالیت پسندوں کا کہنا ہے کہ حواس کا عالم محض ظواہر پر مشتمل ہے جس کا حقیقت سے بھی دور کا واسطہ نہیں۔افلاطون نے اپنے عالمِ امثال کو پارمی نائدس کے احساسِ وجودی کے ساتھ وابستہ کر دیا

اور کہا کہ عالم امثال ہی حقیقی عالم ہے۔جس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا اس کا یہ خیال بھی پارمی نائدس کے افکار سے ماخوذ ہے کہ عالم کی حقیقت معقولات و تجریدات میں ہے محسوسات اور مدرقات میں نہیں۔افلاطون عالم ظواہر کو فریب نگاہ قرار دیتا ہے جو امثال کے سایوں پر مشتمل ہے افلاطون کی مثالیت پسندی عقلیاتی ہے کیونکہ اس کے خیال میں عالم حقیقی کا عقلیاتی وقوف ممکن ہے، علم کا آخذ حسیات میں نہیں بلکہ عقل واستدلال میں ہے اور اس کی امثال لاتعداد ہیں اور منتشر نہیں بلکہ مدون ہیں، ان کی ترتیب وترکیب منطقی ہے ان میں سب سے اعلیٰ خیر ہے۔سقراط سے اس نے یہ خیال لیا ہے کہ کائنات کا ایک اخلاقی نظام ہے جس میں خیر حسن اور صداقت کی ازلی وابدی قدریں کارفرما ہیں۔یہ قدریں معروضی حیثیت میں موجود ہیں خیر کی مثل اعلیٰ ہی خدا ہے۔لیکن یہ خدا کے مذہب کی طرح یا خدا کی طرح کوئی ذی ارادہ شخصیت نہیں ہے محض ایک منطقی اصطلاح ہے۔افلاطون نے عالم کے فریب نظر ہونے حیات وموت اور روح کی بقاء، تنسخ ارواح کے تصورات فیثا غورث کے عارفی مت سے لیے ہیں۔ہیریکلیتس نے سکونِ وجود سے انکار کیا تھا اور کہا کہ دنیا میں ہر کہیں حرکت ہے ہر شئے تغیر پذیر ہے افلاطون نے یہ خیال علم حواس میں منتقل کر دیا اور کہا کہ اس میں ہر کہیں حرکت وتغیر کی کارفرمائی ہے۔جب کہ عالم امثال ازلی و سکونی ہے۔افلاطون کا فلسفہ جو حقیقت وظواہر یا غیر مرئی حقیقی اور مرئی حقیقی کے فرق پر مبنی تھا بعد میں اس کو مذہب کی تصدیق وتوثیق میں برتا گیا۔اہل مذہب بھی عالم ظواہر کو عارضی اور عالم عقبیٰ کو حقیقی مانتے ہیں۔اس عالم کو ارواح کا زندان سمجھتے رہے ہیں جس سے چھٹکارا پا کر روحیں کسی دوسرے عالم کو منتقل ہوتی ہیں۔

افلاطون نے اپنے اس خیال کو کہ عالم ظواہر عالم امثال کا سایہ ہے غار کی مشہور تمثیل سے واضح کیا ہے۔وہ کہتا ہے فرض کریں کہ ایک غار ہے جس میں چند قیدی یوں جکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کہ وہ اپنے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتے ان کی پچھلی طرف آگ کا ایک آلاؤ بھی روشن ہے جس کے باعث قیدیوں کے عقب سے گذرنے والوں کے سائے قیدی سامنے کی دیوار پر دیکھتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ ان سایوں کی حقیقت کیا ہے یا گذرنے والے کون ہیں۔چنانچہ افلاطون کہتا ہے کہ اسی طرح ہم بھی اس دنیا میں صرف امثال کے سائے دیکھ سکتے ہیں مثال کے طور پہ ہم حسن ازل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر اس دنیا کے خوبصورت چہروں، قدرتی مناظر میں، پھولوں میں، پودوں میں، قوس قزح میں، بدلتے موسموں میں

بکھرتے بادلوں کے حسن میں حسن ازل کا پرتو دیکھ سکتے ہیں۔ حسن ازل کا یہ تصور بعد میں سریت پسندوں اور صوفیوں نے اپنا لیا اور اس کی بے انتہا کشش کے باعث اس کو عشق حقیقی کا نام دے دیا۔ افلاطون کے مطابق اس کے نظام امثال کو صرف جدلیات کے علم سے ہی جانا جا سکتا ہے اور اس کے بقول یہ علم بہت کم لوگوں کو ارزانی ہوتا ہے۔ افلاطون کی مثالیت پسندی نے وہ اصول وضع کیے جن سے بعد کے مثالیت پسندوں اور اہل مذہب نے فیضان حاصل کیا۔ افلاطون کے ان افکار سے بعد میں عیسائی متکلمین اور مسلمان صوفیا نے معذرت خواہی کا کام لیا کیونکہ یہ تصور مذہب و تصوف کے موافق تھے۔ اسی بنا پر ولی آگسٹائن نے افلاطون کو فلاسفہ کا مسیحا کہا اور امام غزالی کو الہٰیون میں شمار کیا۔ ارسطو بھی اپنے استاد کی طرح مثالیت پسند تھا البتہ اس نے افلاطون کی بعض فکری کوتاہیوں پر گرفت کی ہے۔ مثلاً افلاطون نے اس بات کی منطقی توجیہ نہیں کی کہ امثال یا تجریدات جو عالم مادی سے ماوراء ہیں عالم مادی کی تخلیق کیسے کرتے ہیں۔ اس اشکال کو افلاطون نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ ایک افسانوی معمار ہے جو مادے پر امثال کی چھاپ لگاتا رہتا ہے۔ ارسطو نے اس تردد کو دور کرتے ہوئے کہا کہ ہیت (Potential) یا افلاطون کا مثل عین مادہ سے علیحدہ نہیں بلکہ اس کے بطون میں ہی موجود ہوتا ہے۔ کائنات ازلی و ابدی ہے امثال اور مادہ ازل سے موجود ہیں ہر مادی شئے بالقوہ سے بلفعل ہوتی ہے اور یہی عمل دنیا میں حرکت و تغیر کا اصل سبب ہے۔

فاعل کسی ہیت کو خلق نہیں کرتا ایسا کرے تو وہ عدم سے خلق کرے گا جو قطعی محال ہے ارسطو نے خدا کو علتِ العلل کہا ہے جو کائنات کی علتِ غائی بھی ہے جس کی طرف کائنات اپنی تکمیل کے لیے حرکت کر رہی ہے۔ ارسطو نے خدا کو فکر کی فکر اور محرک غیر محرک بھی کہا ہے۔ ارسطو کا خدا بھی افلاطون کے خدا کی طرح غیر شخصی ہے۔ ارسطو کے فلسفے میں افلاطون کے نظام کی طرح یہ خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ کائنات میں مقصد و غایت موجود ہے۔ عیسائیت کی اشاعت کے ساتھ رومۃ الکبریٰ اور اس کے ملحقہ ممالک میں عقلی و فکری عمل دب کر رہ گیا۔ قسطنطین اور جسٹین نے آزاد خیالی یعنی آزادانہ علمی روایت کا قلع قمع کر دیا۔ مشہور مورخ (Gubben) لکھتا ہے کہ عیسائیت کی فتح کے ساتھ مغرب پر تاریک صدیوں کے گھمبیر اندھیارے چھا گئے یورپ کے اس دورِ جاہلیت میں عربوں نے علم کی شمع روشن کی اور نہ صرف فلاسفہ یونان کی کتابوں کو تہہ خانوں سے نکال کر اُن کے ترجمے کرائے بلکہ سائنس میں بھی گراں قدر اضافے کیے

۔عرب سائنس دانوں نے کیمیاء طبیعات علم المناظر، ہیت، طب، جغرافیہ اور علم التحلیل میں دادِ تحقیق دی۔ ان کی بدقسمتی سے متوکل عباسی کے دور میں رجعت پسند ملّا برسرِ اقتدار آ گئے۔ اور انھوں نے سائنسی علوم کا گلہ گھونٹ دیا اور سائنسدانوں اور فلاسفہ کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان حالات میں قدرتاً عرب سائنس دان اپنے تجربات سے اخذ کیے ہوئے نظریات کا اظہار نہ کر سکے اور سائنس کو سخت دھچکا لگا۔ ابن خلدون کی باریک نگاہوں نے یورپ میں ابھرتی ہوئی نشاطِ ثانیہ کو بھانپ لیا تھا وہ اپنے مقدمے میں لکھتا ہے کہ تاریک دماغ فقہاء کی تعدی کے باعث دنیائے اسلام میں علمی تحقیق کا بازار سرد پڑ گیا ہے جب کہ مغرب میں تحصیل علوم کا جوش بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

سائنس کی تاریخ میں سترہویں صدی کے حالات خاص طور پر قابل لحاظ ہیں کہ اس صدی میں سائنس کو جو فروغ نصیب ہوا وہ گذشتہ دو ہزار سال میں بھی نہ ہوا تھا۔ اہل مغرب کے ذہن و دماغ پر سے صدیوں کی جمی ہوئی پھپھوندی ہٹ گئی اور اہل علم نے از سر نو مذہبی عمرانی اور علمی مسائل پر آزادانہ غور و فکر کرنا شروع کیا۔ پھر ''دے کارت'' کا عہد آیا جس کو جدید فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے وہ فلسفی ہونے کے علاوہ سائنس دان بھی تھا اور عالم ریاضیات بھی تھا۔ اس کا فکری رویہ جدید طبعیات اور ہیت سے تشکل پذیر ہوا۔ اس نے اپنی فلسفیانہ جستجو کا آغاز شک سے کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف ایک حقیقت ایسی ہے جو شک و شبہ سے بالاتر ہے اور وہ یہ ہے کہ

''میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں''

اسی اصول کو اس کے فلسفے اور نظریہ علم کی کلید سمجھا جاتا ہے۔ اس سے ایک تو ذہن کا وجود مادے کے وجود سے زیادہ یقینی ثابت ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مادے کو ذہن کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے اور خارجی اشیاء کا علم ذہن سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ حواس سے۔ ''دے کارت'' کی یہ موضوعیت جدید فلسفے میں روح کی گہرائیوں تک سرایت کر گئی اور مثالیت پسندوں نے خاص طور سے اسے اپنے منطقی استدلال کا عنوان بنا لیا۔ دے کارت کی موضوعیت نے جدید مغربی فکر میں فردیت اور اَنا پرستی کے رجحان کو پروان چڑھایا جو جرمنوں کی مثالیت پسندی میں سرایت کر گیا ''دے کارت'' کے فلسفے کا حاصل یا اصل اصول '' میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں'' کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ہر شخص کے لیے اس کا اپنا ذہن ہی علم کا معیار ہے اور علم کا کوئی معروضی معیار ہو ہی نہیں سکتا۔ جرمن رومانی فلسفہ سے لے کر ''ژاں پال سارتر''

تک کی موضوعیت اور فردیت اسی اصول کی صدائے بازگشت ہے۔ دے کارت کے ہاں مادہ وہی ہے جس کا ادراک کیا جا سکے یعنی مادہ مدرکات سے الگ اپنا کوئی معروضی وجود نہیں رکھتا یہی اِدعا جملہ مثالیت پسندوں کا بھی ہے۔

جدید دور کی مثالیت پسندی عضویاتی طور پہ رومانیت سے وابستہ ہے جس کا باوا آدم "روسو" کو کہا جاتا ہے۔ روسو نے عقلی تفکر اور سائنس کی مخالفت کی تھی وہ فطرت کی جانب لوٹ جانے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے قاموسیوں کی خرد پسندی اور دانش دوستی کے خلاف قلمی جہاد کا آغاز کیا۔ قاموسی دانش اور سائنس کی روشنی میں جملہ علمی معاشرتی اور اقتصادی عقدے حل کرنے پر اسرار کرتے تھے اور بڑے جوش و خروش سے اس امید کا اظہار کرتے تھے کہ انسان سائنس کی مدد سے قدیم زمانے کے توہمات اور مذاہب سے پیچھا چھڑا کر ایک نیا ترقی پرور معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس میں روشن خیالی اور حقیقت پسندی کا دور دورہ ہو گا۔ وہ مذہب اور جہالت کو انسانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور عقل و خرد پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔

فلسفہ مادیت کا آغاز

اس کے بعد سائنس اور مادہ پرستی کا دور آیا۔ چونکہ سائنس اور مادیت باہم ملحق فطرت کے حامل ہیں اس لیے ان کا بیان بھی یکساں ہے۔ ہم اس نقطہ نگاہ کے مبادیات تاریخ کے دریچوں سے کھوجیں گے۔ شعور کی نشو نما کے ساتھ جب قدیم انسان کی دہشت حیرت میں بدل کے رہ گئی تو اس نے فلسفے اور سائنس کی جانب قدم بڑھایا اور اس کے ذہن و دماغ پر صدیوں سے چھائے توہمات کے گھور اندھیارے چھٹنے لگے۔ انسان کے ذہنی وفکری ارتقاء کے لحاظ سے چھٹی صدی عیسوی قبل از مسیح بڑی انقلاب آفرین ہے۔ اس صدی میں جہاں چین، ایران، ہند اور اسرائیل میں کنفوشس، زردشت، گوتم بدھ اور الیسعیاہ ثانی جیسے مصلحین پیدا ہوئے وہیں بحیرہ روم کے ایشیائی کنارے کی ریاست میلٹس میں فلسفے اور سائنس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ طالیس کو سائنس اور فلسفہ دونوں کا بانی کہا جاتا ہے۔ میلٹس کے بقول طالیس فنیقی الاصل ایشیائی تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ طالیس سے پہلے لوگ تفکر و تدبر سے عاری تھے یا مشاہدے اور تجربے سے بے بہرہ تھے۔ قدیم چین، مصر، سمیریا، بابل اور فنیقیہ میں اہل دانش اور خردمندوں کی کمی نہ تھی

ان کے جو مقولے ہم تک پہنچے ہیں وہ ان کی گہری دانش و بصیرت پر دلیل ہیں۔ لیکن ایک مدلل علم کی حیثیت سے ان کے ہاں منطق، جدلیات اور مابعد الطبیعات کا کوئی وجود نہ تھا۔ تاہم طب، مساحت اور علم الحیل وغیرہ کے بنیادی اصول وضع کر لیے گئے تھے۔ کلیں بنا لی گئی تھیں اور مختلف تجربات کیے جا رہے تھے۔ پروہت عوام کے ذہن و دماغ پر اپنی گرفت کو بحال رکھنے کے لیے اپنے دیوتاؤں کے مجسّموں میں ایسی کلیں نصب کیا کرتے تھے جن کے باعث خاص خاص تہواروں پر مجسّمے اپنے سر ہلاتے تھے یا سورج کی پہلی شعاعوں کے پڑنے سے دیوتا کی مورتی کے منہ سے سریلی آوازیں نکلتی تھیں۔

ہندوستان میں سومنات کے مندر میں ایک لنگ (عضو تناسل) ہوا میں معلق رہا کرتا اس لیے کہ دھات سے بنے اس لنگ کے اوپر اور نیچے مقناطیس کو اس انداز ے سے نصب کیا گیا تھا کہ دونوں مقناطیسوں کی طاقت نہ اسے اوپر جانے دیتی تھی اور نہ ہی اسے زمین پر گرنے دیتی تھی۔ چنانچہ لنگ کے سادہ لوح پجاری سائنس کے اس ادنیٰ کرشمے کو اپنے مذہبی عقیدے کی رفعت تصور کیا کرتے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ عملی و تجربی سائنس کا آغاز بھی مذہب کے دامن میں ہی ہوا۔ دراصل پروہت عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ان کی دیویاں اور دیوتا ذی حیات اور ذی شعور ہستیاں ہیں جو اپنے پروہتوں کا کہا مانتے ہیں۔ بابل کے پروہت اپنے آپ کو دیوتاؤں کے معمولات سے آگاہ رکھنے کے لیے راتوں کو اپنے مندروں کے مناروں پر چڑھ کر آسمان کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ ان مشاہدات کی تفصیلات کو باقاعدگی سے محفوظ کیا جاتا۔

چنانچہ چھٹی صدی عیسوی قبل از مسیح سے کئی سو برس پہلے بابل کے پروہت سورج گرہن اور چاند گرہن کی درست پیش گوئیاں کرنے لگے تھے اس لیے نہیں کہ ان کو سائنسی علوم سے دلچسپی تھی بلکہ یہ علم دراصل ان کا کاروبار تھا کیونکہ جب گرہن کا وقت قریب آتا تو معبدوں میں اعلان کیا جاتا کہ ان کے مہربان اور حیات بخش دیوتا کی جان خطرے میں ہے اور تاریکی کا عفریت اس پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے لوگ خوفزدہ ہو کر ان کے پاس ہجوم کر آتے اور قیمتی نذرانے دے کر گڑگڑاتے کہ کسی طرح سورج دیوتا کو بچایا جائے۔ پھر جب گرہن چھٹ جاتا تو ہر طرف خوشی کے شادیانے بجائے جاتے اس طرح سائنس کے اہم انکشافات پر صدیوں توہمات کے دبیز پردے پڑے رہے۔ طالیس ملیطی کی پیدائش سے کم و بیش دو ہزار سال پہلے عراق میں بابل، اشور اور مصر میں ممفس اور تھیبس کے شہر تہذیب و تمدن کے گہوارے بن چکے تھے جہاں جادو، شمن مت، کہانت، علم نجوم اور فال گیری جیسے توہمات کے پردوں میں ریاضی، ہیت

مساحت اور طب کے تحقیقی علوم کی بنیادیں پڑ چکیں تھیں۔ ما عصر اقوام کے طلبہ دور دراز کے شہروں سے سفر کر کے بابل اور مصر آیا کرتے تھے۔ طالیس نے بھی بابل اور مصر ہی سے علم فیض پایا اور علوم تحقیقی میں اس قدر استعداد حاصل کر لی کہ اس کا شمار مشاہیر داناؤں میں ہونے لگا۔ علم ہیت اور ریاضیات کے علاوہ طالیس نے مساحت کی بھی تحصیل کی طالیس کے مرتب کیے ہوئے اصولوں پر جو بابل اور مصر سے اخذ کیے گئے تھے۔ ان سے بعد میں اقلیدس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تصنیف کی مصر اور بابل سے تحصیل علم اور فیض یابی کا یہ سلسلہ بعد میں بھی صدیوں تک جاری رہا۔ فیثا غورث اور افلاطون، زینو اور اپیکو روس کے بارے میں مسلّم ہے کہ انھوں نے مصر اور بابل کے اہل دانش سے کسب فیض کیا۔

مصر اور بابل کے علاوہ کنعان اور فنیقیہ بھی علوم وفنون کے مرکز بن گئے تھے اور قدمائے یونان فنیقیوں کو اپنا استاد کہا کرتے اور یہ اعزاز بھی ایک فنیقی کو ہی حاصل ہوا کہ اس نے مذہب اور دیومالا کے توہمات سے ہٹ کر ریاضیاتی مساواتوں کی بنیاد پر سورج گرہن کی سچی پیش گوئی کی۔ اس طرح طالیس نے علم ہیت کو علم نجوم کی خرافات سے پاک کر کے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور تاریخ میں پہلی بار نظری سائنس کی بنیاد رکھی۔ دوسری طرف طالیس نے تاریخ عالم میں پہلی بار یہ سوال اٹھایا کہ کائنات کیسے وجود میں آئی اور اس کی تکوین کا اصل اصول کیا ہے۔ طالیس کے زمانے تک پرہتوں کا خیال تھا کہ یہ کائنات ایک بہت بڑے انڈے سے نکلی ہے یا جادو کے ایک کلمے سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔ طالیس نے اس سوال کا علمی جواب دینے کا جتن کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کائنات کی بنیاد پانی ہے اور پانی ہی اس کی تکوین کا اصل اصول ہے۔

آج طالیس کے اس اصول کو خندہ آور سمجھا جائے گا لیکن فلسفے اور سائنس کی تاریخ میں یہ بات اہم ہے کہ طالیس نے تکوین کائنات کے طبیعی اسباب معلوم کرنے کی کاوش کی۔ اس پہلو سے طالیس کو نیوٹن، گلیلو کیپلر اور آئن سٹائن کا پیش رو سمجھا جا سکتا ہے جنہوں نے جدید سائنس کو مذہب اور باطنیت کی غلامی سے نجات دلائی۔ چنانچہ یہ سمجھا جائے گا کہ طالیس کی ذات سے ہی طبیعی سائنس کا آغاز ہوا جس سے مظاہر کائنات میں آزادانہ غور وفکر کر کے ان کے تحقیقی وعلمی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ طالیس کے دو ہم وطن فلاسفر انا کسی مینڈرس اور انا کسی مینس نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ کائنات کی اصل مادہ ہے۔ انا کسی مینس نے کہا کہ کائنات میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ حرکت کے طفیل ہوتی ہیں جو

ازلی وابدی ہے۔اناکسی مینڈرکس کے خیال میں کائنات پانی سے نہیں بنی بلکہ یہ ایک لامحدود زندہ شئے ہے جو حرکت کے سبب ٹکروں میں بٹ گئی اور مظاہر عالم وجود میں آ گئے۔اس نے بقائے اصلح اور ماحول سے موافقت کا ذکر کر کے ڈارون کی پیش قیاسی کی ہے اس کے خیال میں انسان حیوان کی ارتقاء یافتہ صورت ہے۔ہیریکلیتس کا دعویٰ تھا کہ کائنات پانی ہوا آگ اور مٹی سے نہیں بنی بلکہ آگ سے بنی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے کچھ حصے روشن ہوتے ہیں اور کچھ بجھے رہتے ہیں۔اس کے خیال میں کائنات میں کسی شئے کو سکون نہیں ہر وقت ہر شئے حرکت میں رہتی ہے ایمپی ویکلس کا نظریہ تھا کہ کائنات کی بنیاد عناصر اربعہ پہ ہے۔طالیس اور اس کے ہمنواؤں کی مادیت پسندی دیما قریطس کے افکار میں نقطہ عروج کو پہنچ گئی۔دیما قریطس نے لیوکپس کے ساتھ مل کر ایٹموں کا نظریہ پیش کیا جو قدمائے یونان کے نظریات کی نسبت جدید سائنس کے قریب تر تھا۔اس میں سقراط اور افلاطون کے برعکس عالم طبیعی کی تشریح بغیر کسی علت غائی یا مقصد سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے کہ دیما قریطس کے خیال میں روح اور عقل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں روح بھی دوسری اشیاء کی طرح ایٹموں سے مرکب ہے،فکر و خیال ایک طبیعی عمل ہے روح کے انکار کے ساتھ اس نے حیات بعد موت کو بھی رد کر دیا۔اس کے خیال میں کائنات سراسر مادی ہے اور اس میں کسی ماورائی ذہن یا شعور کا کوئی وجود نہیں۔تمام فطری مظاہر پر اندھے میکانکی قوانین حاوی ہیں اور انسان بھی پودوں اور پتھروں کی طرح ایٹموں سے مرکب ہے جنھیں وہ سانس کے ساتھ باہر پھینکتا ہے اور پھر اندر کھینچ لیتا ہے اور اس عمل کے خاتمے پر وہ مر جاتا ہے اور اس کے ایٹم فضاء میں منتشر ہو جاتے ہیں۔

دیما قریطس ایک مذہب بیزار شخص تھا وہ دیوتاؤں کا بھی منکر تھا وہ کہتا ہے کہ مذہبی عقائد نے انسان کو خوفزدہ کر رکھا ہے اور کائنات میں کسی قسم کا کوئی مقصد نہیں اس میں صرف ایٹم ہیں جو میکانکی قوانین کے تحت ترتیب پاتے ہیں یا بکھر جاتے ہیں۔دیما قریطس یونان قدیم کے مادی یا طبیعی فلسفے کا آخری ترجمان تھا جس کا نقطہ نظر سائنٹیفک تھا اور جو ذوق و تجسس سے سرشار تھا۔زندگی کے بارے میں اس کا اندازِ نظر رجائی تھا۔اس کے خیال میں زندگی کا واحد مقصد مسرت کا حصول ہے جو میانہ روی اور تہذیب نفس سے ارزانی ہوتی ہے۔وہ جذباتی ہیجان اور جوش وخروش کا مخالف تھا اس لیے عورت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کیونکہ عورت مرد کے جذبات کو بھڑکاتی ہے جس سے اس کا نفس اس پہ غلبہ پا لیتا ہے۔بعد میں اس کے

خیالات کی ترویج کا فریضہ اپیکورس اور لکریشس نے انجام دیا۔ سیاسیات میں وہ جمہوریت اور انسانی مساوات کا قائل تھا اس کے دور میں مادی فلسفہ کے بنیادی افکار مرتب ہوئے جو بعد میں مادیت پسندوں کی فکر و نظر کی اساس بن گئے اس دور میں مادیت پسندوں کا نقطہ نظر آفاقی تھا انھوں نے تکوین کائنات اور مظاہر فطرت کے عقدوں کو تحقیقی انداز میں سلجھانے کی کوشش کی۔ سوفسطائیوں اور سقراط کے ساتھ فکری کاوش کائنات سے ہٹ کر انسان اور اس کے مسائل تک محدود ہو گئی اور انسان کا مطالعہ کائنات کے حوالے سے کرنے کے بجائے کائنات کا مطالعہ انسان کے حوالے سے کیا جانے لگا۔

ایلیاطی فلاسفہ زینوفینس پارمی نائڈس اور زینو کا رشتہ روحانی فکر اور مادیت پرستی دونوں کے ساتھ استوار رہا وہ کائنات کو خدا سے واحد الاصل مانتے تھے۔ پارمی نائڈس نے زینوفنیس کے افکار کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ کائنات کا اصل وجود ہے جو واحد حقیقت ہے۔ کوئی شئے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی لہٰذا وجود کے سوا کسی شئے کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ حقیقی وجود ایک ہے جسے ہم عقل استدلالی سے جان سکتے ہیں وہ کہتا ہے کہ حواس کا عالم ظواہر کا عالم ہے جو محض دکھاوا ہے، غیر حقیقی ہے، وہم باطل ہے۔ عالم حقیقی اور عالم ظواہر کی یہ تفریق مثالیت پسندی کی بنیاد ثابت ہوئی۔ ایلیاطیوں کی وحدت الوجود کے اثرات مثالیت پسندی کے علاوہ تصوف اور سریت پر بھی ہوئے اناکسی غورس نے کہا تھا کہ خدا عالم سے ماورا کوئی خارجی قوت ہے۔ اس پر ارسطو نے بجا طور یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ تعلیم توحید کی نہیں ثنویت کی ہے۔ ایلیاطیوں کی احدیت یا وحدت الوجود اصلاً مادیت پسندی ہے کیونکہ وہ کائنات کو ہی وجود واحد کہتے ہیں بعد میں سریت پسندوں، مثالیت پسندوں اور باطنیہ نے وجودِ واحد کو خدا کا درجہ دے کر اسے مذہب کا جامہ پہنا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی احدیت پسند با مذہب نہیں ہوسکتا۔ احدّیت میں ایک ذی ارادہ اور بااختیار خدا کا انکار لازم آتا ہے اس لیے احدّیت اور واحدانیت میں بعُد المشرقین ہے۔ پارمی نائدس کو عقل استدلالی پر کامل اعتماد تھا وہ کہتا ہے کہ جس شئے پر غور و فکر نہیں کیا جا سکتا اس کا کوئی وجود نہیں ہوسکتا۔ عقلیت پسندی کی اس روایت نے بھی بعد کے فلاسفہ کے افکار پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ساتھ یونانی فلسفے میں بھی مثالیت پسندوں کا رجحان غالب آ گیا اس لیے ان کے افکار کی مقبولیت کے باعث مادیت پسندی کی روایت دب کر رہ گئی۔ ارسطو کے بعد یونانی معاشرہ تنزل پذیر ہو گیا اور اس سیاسی تنزل کا اثر فکر و نظر پر بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ پھر جب یونان کو رومۃ الکبریٰ کا ایک صوبہ

بنا دیا گیا تو انھوں نے فلسفہ اور دوسرے علوم کی تدریس کا کام یونانی غلاموں کے سپرد کر دیا کہ وہ خود عملی کے قسم کے لوگ تھے اور فلسفیانہ بحثوں سے دور بھاگتے تھے اس لیے ان کے بہترین دل و دماغ نظم مملکت اور تسخیر ممالک کے لیے وقف ہو کے رہ گئے۔ رومہ کے دورِ تسلط میں دو مکاتبِ فکر صورت پذیر ہوئے۔ اپیکورس نے لذتیت اور زینو نے رواقیت کے فلسفے وضع کیے۔ اپیکورس کا تعلق دیما قریطس کی روایت سے تھا جو پکا مادیت پسند تھا۔ دیما قریطس کی طرح اپیکورس کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ عالم مادی ایٹوں سے مرکب ہے جو فطری قوانین کے تحت ترکیب پاتے اور منتشر ہو جاتے ہیں، روح مادی ہے اور اس کے ایٹم تمام جسم میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر روح مادی نہ ہوتی تو ہم خوشی یا غم کیسے محسوس کر سکتے ہیں۔ روح کے بھی ایسے ہی ایٹم ہوتے ہیں جیسے کہ حرارت یا سانس کے ہوتے ہیں۔ البتہ وہ دیما قریطس کی جبریت کا منکر ہے اور انسانی قدر و اختیار کا قائل ہے۔

وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی گریز پا ہے اس لیے جہاں تک ممکن ہو اسے ہنسی خوشی گزارنا ہی سچا فلسفیانہ رویہ ہے۔ اس کے خیال میں انسان حسیات کے واسطے ہی علم حاصل کر سکتا ہے اور حس یا مشاہدہ ہی صداقت کا معیار فراہم کرتے ہیں۔ اس کا اخلاقیاتی اصول یہ ہے کہ خیر وہ ہے جو مسرت بخش ہو اور شر وہ ہے جو اذیت کا باعث بنے جیسا کہ عام خیال ہے اپیکورس جسمانی لذت پر زور نہیں دیتا اس کے خیال میں ذوقی لذائذ مادی لذائذ پر فوقیت رکھتے ہیں اور ایک دانش ور ہی سچی مسرت سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ اخلاق یا خیر مقصود بلذات نہیں بلکہ مسرت کے حصول کا وسیلہ ہے۔ سیاسی سرگرمیاں ذہنی پریشانی کا باعث ہوتی ہیں اس لیے ایک مرد دانا سیاسی امور میں دلچسپی نہیں لیتا اور گوشہ عافیت میں بیٹھ کر سکون اور آسودگی کی زندگی گذارتا ہے۔ کسی ذی عقل فرد کی تگ و تاز کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ مسرت کے حصول کی کوشش کرتا ہے اور درد و اذیت سے پہلو بچاتا رہے۔

اپیکورس کے بارے میں رواقیوں کی یہ تعریض درست نہیں کہ وہ کھانے پینے جنسی ملاپ کرنے اور لیٹ کر خراٹے بھرنے کی دعوت دیتا ہے اس کے خیال میں دوستی جو خلوص اور دلسوزی پر مبنی ہو انسان کو لطیف ترین مسرت بخشتی ہے۔ اپیکورس اس لحاظ سے خوش نصیب تھا کہ اسے کئی مخلص اور بے لوث دوستوں کی رفاقت میسر تھی اس لیے جب وہ مرا تو اس نے اپنا تمام اثاثہ اپنے دوستوں کے بچوں کے لیے چھوڑ دیا اپیکورس نے مسرت پر بحث کرتے ہو لکھا ہے کہ انسان کو دو چیزیں سچی خوشی سے محروم رکھتی ہیں۔ ایک مذہب اور

دوسرا موت کا خوف۔اس کے بقول مذہب نے حیات بعد موت کا جو تصور پیش کیا ہے اس نے انسانی مسرت کے سرچشمے میں زہر گھول دیا ہے اس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ تھا کہ جسم کی موت کے ساتھ ہی روح بھی فنا ہو جاتی ہے اس لیے عالم عقبیٰ کی دہشت بے معنیٰ اور بے بنیاد ہے اسی طرح موت کا خوف بھی قرین دانش نہیں کہ ''جب تم ہوگے تو موت نہ ہوگی اور جب موت ہوگی تو تم نہ ہوگے'' اپیکورس کے شاگردوں میں لکریشس نے شہرت پائی۔

اس کی مشہور نظم اشیاء کی ماہیت کے بارے میں ہے جو مادیت پسندی کا صحیفہ مانی جاتی ہے۔لکریشس بھی کسی معبود یا دیوتا کا قائل نہ تھا اور کہتا تھا کہ مذہب دہشت کی پیداوار ہے۔کائنات میں سلسلہ سبب و مسبب کا قانون ذہن نشین کر لینے سے دہشت کا یہ احساس دور ہو جاتا ہے اور آدمی مذہب کی گرفت سے آزادی حاصل کر لیتا ہے۔اس کے بقول مذہبی مفہوم میں جنت اور دوزخ بھی محض تخیل کی پیداوار ہیں۔ ذہنی سکون اور طمانیت ہی جنت ہے اور دلی خلفشار اور خوف ہی دوزخ ہے۔وہ کہتا ہے کہ مذہب نے بنی نوع انسان پر بہت ظلم ڈھائے ہیں اور اس کے نام پر بے شمار بے گناہوں کا خون نہایت بے دردی سے بہایا گیا ہے۔اپیکورس کی طرح اس کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ کائنات ازلی و ابدی ہے جس پر اٹل قانون کارفرما ہیں۔ان قوانین کو بدلنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

اس کے خیال میں جب تک انسان مذہب سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرے گا وہ ذہنی سکون اور فراغِ خاطر سے بہرہ ور نہیں ہوگا۔رواقیت کا بانی زینو بھی طالیس کی طرح ایک فنیقی الاصل ایشیائی تھا۔وہ ایک منقش طاق کے نیچے بیٹھ کر درس دیا کرتا تھا طاق کے لیے عربی میں رواق کا لفظ آیا ہے اس لیے عربوں نے اس کے فلسفے کو رواقیت کہنا شروع کر دیا۔(۹) حقیقت یہ ہے کہ رواقیت بھی مادیت پسندی ہی کا ایک مکتب ہے۔رواقی کائنات میں جبریت اور انسان میں قدر و اختیار کے قائل ہیں وہ جذبات کے اظہارِ بے اختیار کی مذمت کرتے تھے اور ضبطِ نفس کو اخلاق کا اصل اصول مانتے ہیں۔وہ مابعدالطبعیات کے مخالف تھے اور کہتے تھے کہ علم مدرکات کے واسطے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ان کے خیال میں روح پیدائش کے وقت ایک سادہ تختی ہوتی ہے جس پر ماحول کے اثرات ثبت ہوتے رہتے ہیں جیسے کہ موم پر مہر کا نقش لگتا ہے یہی تاثرات عقل استدلالی کے طفیل معقولات اور تجریدات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔اسی بنا پر رواقیوں نے افلاطون کے امثال کو رد کر دیا تھا جنھیں وہ ازلی و ابدی سمجھتا تھا۔ان کی منطق کا اصل اصول

یہ ہے کہ ذہن انسانی محسوسات و مدرکات کے واسطے کے بغیر کسی قسم کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کی طبعیات کی رو سے کوئی غیر مادی شئے وجود نہیں رکھتی اس لیے وہ روح اور خدا کو بھی مادی قرار دیتے تھے۔ اس مادیت پسندی پر انھوں نے وحدت الوجود کا پیوند لگایا اور کہا کہ خدا روح عالم ہے وہ خدا کو عقلِ مطلق بھی کہتے تھے لیکن روح کی طرح عقل کو بھی مادی مانتے تھے۔ ان کا خدا مذہب کے خدا کی طرح کوئی ذی ارادہ ہستی نہیں ہے بلکہ کائنات ہی خدا ہے وہ ہمہ گیر دوستی کا پرچار کرتے ہیں اور اپیکورس کے برعکس سیاسیات میں گہری دلچسپی لینے کے قائل ہیں کیونکہ ان کے خیال میں سیاسی جدوجہد ہی سے عوام کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکتا ہے اس طرح ان کی اخلاقیات اُنا پسندی پر نہیں بلکہ عوامی فلاح پر مبنی ہیں ان کا انسان دوستی کا اخلاقیاتی نصب العین افلاطون اور ارسطو کے اخلاقی نصب العین سے برتر ہے۔ اس لیے کہ افلاطون اور ارسطو نے ریاست کی فلاح کے لیے غلامی کو ضروری قرار دیا تھا جب کہ رواقی مکمل انسانی مساوات کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ سب بنی نوع انسان خواہ وہ یونانی ہوں یا غیر یونانی، عورتیں ہوں یا مرد، امیر ہوں یا غریب، دانش مند ہوں یا اَن پڑھ آقا ہوں یا غلام تندرست ہوں یا علیل ہر حالت میں مساوی انسانی حقوق کے حامل ہیں۔ رواقیوں کے کئی اصول بعد میں کلیسائے روم کی تعلیمات میں شامل کر لیے گئے۔ رومۃ الکبریٰ کے دورِ تنزل میں عیسائیت کی اشاعت ہوئی جس کی ترویج میں قیصر قسطنطین نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ قیصر جسٹین نے ایتھنز میں فلسفہ کی تمام درس گاہیں بند کرا دیں اور یورپ پر جاہلیت کے اندھیرے چھانے لگے۔ رسل کے الفاظ میں فلسفہ جو مذہب سے نکلا تھا دوبارہ مذہب میں جذب ہو گیا۔ ان تاریک صدیوں میں فلسفے کو کلیسا کی لونڈی بنا کے رکھ دیا گیا اور اس کا علمی رسوخ خیال و خواب ہو کے رہ گیا۔ اب فلسفے کی جگہ علم کلام نے لے لی تھی جس میں فلسفے کا کام بس اتنا تھا کہ وہ پوپ کے نظریات کی توثیق کرتا رہے (۱۰)۔

مادیت و روحانی تہذیب

سترہویں اور اٹھارویں صدی کے یورپ میں روایت پسندی(Traditionalism) اور کلیسائی استبداد اپنے زوروں پہ تھا۔اس دور کے تنگ نظر پادریوں نے قدیم یونانی فلسفے اور عیسائی معتقدات کے امتزاج سے بہت سے خودساختہ نظریات قائم کر رکھے تھے اور ان نظریات کے خلاف اٹھنے والی کسی بھی آواز کو وہ مذہب کے لیے خطرہ قرار دیتے تھے۔شاہی نظام جبر کے ساتھ تنگ نظر پادریوں کے گٹھ جوڑ نے ایک ایسا استبدادی نظام قائم کر رکھا تھا جس میں کسی بھی آزاد اور علمی تحریک کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ معاشرے کی گھٹن کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ سقراط کو اپنے علمی نظریات کے تحفظ کے لیے آخر زہر کا پیالہ پینا پڑا۔چنانچہ اس نظام جبر کے خلاف جن نظریاتی تہذیبی سیاسی اور سماجی تحریکوں نے جنم لیا انھی کو بعد میں مادیت پسند کہا گیا اور جن کے افکار و نظریات کی بنیاد پر آج کے جدید مغرب کی بنیادیں استوار ہیں۔ابتدائی مراحل میں یہ تحریکیں مذہب سے کلیتاً لاتعلقی کے تخیل سے خالی تھیں بلکہ ان کے پیش نظر محض اس استحصال کا خاتمہ تھا جو مذہب کے ٹھیکیداروں نے عام لوگوں کے ساتھ روا رکھا ہوا تھا۔یہ لوگ

قدامت اور روایت پسندی کے خلاف تھے اس لیے لامحالہ ان کو جدیدیت کے علمبردار کہا گیا جدیدیت کی ان تحریکوں کے جنم لینے میں کئی عوامل کارفرما رہے تھے جس میں سے ایک اسپین کی اسلامی تہذیب کے ساتھ طویل تعامل بھی تھا جس کی وجہ سے عیسائی دنیا میں بھی اب حریت فکر کی آوازیں آنے لگیں تھیں۔ چنانچہ قرطبہ اور غرناطہ میں حاصل شدہ سائنس کے درس اب رنگ لا رہے تھے اور یورپ کے سائنس دان بھی آزادانہ تجربات کرنے لگے تھے اور مساوات کے اسلامی تصور کے اثرات نے جنوبی اٹلی سے لے کر سسلی تک انسان دوستی (Humanism) کی تحریکیں کھڑی کر دی تھیں۔ ان سب عوامل نے مل کر کلیسا کے جبر واستبداد کے خلاف ایک شدید ردِعمل پیدا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں جدیدیت کی حامی تحریکوں کو عوامی تائید حاصل ہوتی چلی گئی۔ چونکہ بیداری کی اس لہر سے قبل پورے یورپ میں شدید نوعیت کی دقیانوسیت اور روایت پرستی کا دور دورہ تھا اس لیے جدیدیت کی اس تحریک نے پورے عہدِ وسطیٰ کو تاریک دور قرار دے دیا تھا اور اس تاریکی سے نکلنے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔

اصل میں جدیدیت کی اس تحریک کا حقیقی ہدف روایت پسندی اور مذہبی تنگ نظری کا خاتمہ تھا مگر ردِعمل کی یہ لہر اتنی شدید تھی کہ اس نے جدیدیت کی اس تحریک کو اعتدال کی راہ سے ہٹا کر ایک دوسری انتہا پہ جا کھڑا کیا جہاں روایت پسندی اور عصبیت کے خلاف جدوجہد کرتے کرتے یہ تحریک مذہب کے بنیادی تصورات اور معتقدات سے ہی انکاری ہو گئی اور اسے ہر شخص کا ذاتی معاملہ قرار دے کے جان چھڑا لی۔ مذہب بیزاری کے اس رجحان کے پیچھے اس دور کے ان مفکرین کے افکار نے بنیادی کردار ادا کیا جو کسی خالق کے وجود سے انکاری تھے۔ چنانچہ جب راہزن کسی قوم کے راہبر بن جائیں تو معاشرے کی اخلاقی سماجی اور تہذیبی بنیادوں سے ابھرنے والا عکس تقریباً وہی تصویر پیش کرے گا جس میں آج کے مغرب کا اصل چہرہ دیکھا جا سکتا ہے جس کی مادی ہوس نے کرہ ارض کا چہرہ لہولہان کر رکھا ہے۔ کلیسا کے جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد کرنے اور معاشرے کو راہ اعتدال پہ ڈالنے کا دعویٰ کرنے والے وہ لوگ جنھوں نے اس تحریک کا آغاز کیا تھا پس پردہ چلے گئے۔ جدیدیت کی اس تحریک کو فرانسس بیکن (م ۱۶۲۶ء)، رینے ڈیکارٹ (م ۱۶۵۰ء) اور تھامس ہوبس (م ۱۶۷۹ء) جیسے بے دانش لوگوں نے اغوا کر لیا اور تمام اہل مغرب کو خالق کے وجود سے بے پرواہ کر دیا۔ انھوں نے اہل مغرب کو انسانی آزادی کے اس تصور سے آشنا کرایا جس میں فلاح کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہ تھا، جس نے اہل مغرب کو روحانی طور پہ اس مہیب خلا

میں جھونک دیا کہ آج اہل مغرب اپنے بچوں کو لفظ خوشی کے حقیقی معنی سے آشنا کرانے کے لیے سکولوں میں علیحدہ کلاسز شروع کرنے پہ غور کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی یورپ کے کسی اولڈ ہوم میں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں بوڑھے اور بوسیدہ گوشت سے جنم لینے والی ایک مخصوص بو کا احساس ہوگا جو انتظامیہ کی تمام تر کوشش کے باوجود بھی ختم نہیں ہوتی تو شاید آپ کو روحانی تشنگی کے اس احساس تک پہنچنے میں آسانی ہو جو کسی بھی آزاد معاشرے کا خاصہ ہے۔ ان کی مادی کامیابیاں اپنی جگہ مگر خاندان کا بنیادی ادارہ ٹوٹنے کی وجہ سے جنم لینے والا خلفشار اتنا خوفناک ہے کہ خود اہل مغرب کا دانشور چیخ چیخ کر اپنے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر زندگی کی جس رفتار کو انھوں نے اختیار کر لیا ہے اس میں کمی اب ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اب ان کے پاس پیچھے مڑ کے دیکھنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ مادی معاشرے تیزی سے اس انتہا کی جانب سفر کر رہے ہیں جس کی دوسری طرف خیر کی کوئی بھی منزل ان کی منتظر نہیں، بلکہ اِک سراب ہے جس کے گہرے سائے میں زندگی کی خواہشات سے مبّرا اور روحانی تشنگی میں بلکتا بوسیدہ گوشت موت کی آرزو میں تڑپتا ہے مگر ریاست کے بے پناہ مادی وسائل اسے مرنے بھی نہیں دیتے۔

بات ہو رہی تھی سترہویں اٹھارویں صدی کے ان دانشوروں کی جن کے افکار نے مادی نظام فلسفہ کو وہ بنیادیں فراہم کیں جن کی وجہ سے اہل مغرب خالق کے وجود سے بے پرواہ ہو گئے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اکثر مغربی معاشرے عیسائی ہیں جو کہ ایک الہامی مذہب ہے اس لیے وہ کسی خالق کے وجود سے کیسے انکاری ہو سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کے انفرادی یا اجتماعی رویے ہی ان کے عقائد کا عکس ہوتے ہیں۔ اگر ہم دنیا میں بسنے والے ایک ارب ساٹھ کروڑ ملحدین (کیمونسٹ) کی زندگی کا طریق دیکھیں اور اس کا موازنہ مغرب کے تمام عیسائیوں سے کریں تو ان کے مابین مشترکات اتنے وسیع ہیں کہ یوں لگتا ہے دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلہ سے ہے اگرچہ دونوں کے طرزِ زیست میں عقیدے کا ایک بڑا فرق تو موجود ہے مگر عملاً اس فرق کو محسوس نہیں کیا جاتا اور ان کی سماجی اخلاقی اور معاشرتی اقدار باہم اس قدر پیوست ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا ایک دشوار کام محسوس ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے چرچ اتنے ویران ہوتے جا رہے ہے کہ ان کے پادری احساس تنہائی کا بوجھ اٹھائے دین مسیح کو ماننے والوں کے منتظر رہتے ہیں مگر امریکہ میں صرف دو فیصد لوگ ہفتے میں صرف پانچ منٹ ہی اپنے دین

کے لیے نکال پاتے ہیں اور چرچ کی سروس کے دوران بھی ان کی نظریں اپنی گھڑیوں پہ ہوتی ہیں (۱۱) ان کے مقابلے میں تو یہودی اپنے عقائد میں زیادہ پختہ اور اپنے تصور دین کے بارے میں زیادہ جذباتی ہیں۔ چنانچہ فرانسس بیکن، رینے ڈیکارٹ اور تھامس ہوبس جیسے مفکرین نے جدیدیت کی اس تحریک کو جو نظریاتی بنیادیں فراہم کیں ان کی بنیاد ہی اللہ کے انکار پہ رکھی تھی اور وہ اپنے ان نظریات کو بغیر کسی شرم کے بیان کرتے ہیں۔ پھر اہل فلاسفہ کا پورا ایک گروہ پیدا ہو گیا جن کی دانش کی بنیاد ہی اللہ کے انکار پہ رکھی تھی مثلاً:

☜ مذہب اس عقیدے کا م نام ہے جس کے مطابق انسان اور کائنات کے مابین توافق پایا جاتا ہے۔ (میکٹے گارٹ)

****

☜ اپنی تنہائیوں سے مفاہمت پیدا کرنے کا نام مذہب ہے۔ (وائیٹ ہیڈ)

****

☜ مذہب اس خیال کا نام ہے کہ کائنات بامعنی ہے۔ (ویلس)

****

☜ مذہب ان بندشوں اور رکاوٹوں کا نام ہے جو انسانی صلاحیتوں کو صلب کر لیتا ہے۔ (سالومن ریناخ)

****

☜ مذہب کامل احتیاج اور انحصار کا نام ہے جو انسان کو بے عملی طرف مائل کرتا ہے۔ (مثاکر ماخر)

****

☜ مذہب ان مافوق الطبع ہستیوں کی پوجا کا نام ہے جو انسان کے خیال میں اس کی زندگی پہ متصرف ہیں۔ (جے جی فریزر)

****

☜ مذہب قدیم زمانے کے انسان کی دہشت کی تخلیق ہے۔ (لکریشس)

****

☜ مذہب انسان کی تمناؤں کی تشنگی کا نام ہے۔ (سپنگر)

****

☜ مذہب ایک پاگل پن کا نام ہے۔ (فرائیڈ)

****

☜ مذہب برتر قوتوں کے متعلق اِک احساس کا نام ہے۔ (مارلے)

****

☜ مذہب بے معنیٰ عمل کو محکم اساس فراہم کرنے کا نام ہے (نا معلوم)

****

☜ مذہب لوگوں کے لیے افیون کی طرح ہے۔ (کارل مارکس)

****

☜ مذہب خوابوں اور تخیلات کی سرزمین ہے۔ (ای۔بی ٹائکر)

****

☜ جب کائنات کی توجیح عقل اور مشاہدے سے کی جاسکتی ہے تو کسی خالق کی کیا ضرورت ہے۔

(رینے ڈیکارٹ)

****

☜ مذہب ایک تخیلاتی اور بے نام سہارے کا نام ہے۔ (ڈیوڈ فارسمتھ)

****

☜ کسی خالق کی کیا ضرورت ہے تم مجھے مادہ لادو میں تمہیں یہ کائنات پھر سے بنادوں۔

(کانٹ)

****

☜ اگر مجھے پانی اور دوسرے کیمیائی اجزا دستیاب ہوں تو میں خود انسان خلق کر سکتا ہوں۔

(ہیگل)

****

☜ اب سائنس کا دور ہے اور خدا مر چکا ہے۔ (نطشے)

****

☜ کائنات صرف مادہ اور اس کی حرکت کا نام ہے۔ (ٹنڈل)

****

یہ ہیں ان مغربی اہل دانش کے وہ تصورات جن کو مادیت کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے جنہوں نے اہل مغرب کی زندگی میں وہ انقلاب بپا کیا جس نے انھیں محض نام کے عیسائی بنا دیا اور وہ دین مسیح کی اساسی تعلیمات

سے اتنے دور جا نکلے کہ آج کہیں کھو جنے سے بھی ان پہ الہامی مذہب کے پیروکار ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔تھامس ہوبس نے کہا کہ یہ دنیا اور کائنات عقل تجربے اور مشاہدے کے ذریعے قابل دریافت (Knowable) ہے۔اس کے تمام حقائق تک سائنس کے ذریعے رسائی ممکن ہے تو پھر کائنات کی دریافت کے لیے کسی اور سرچشمہ کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔میرے خیال میں اس مذہبی تصور کی آج کی جدید دنیا میں اب کوئی گنجائش بھی نہیں اور صرف وہی حقائق قابل قدر ہیں جو عقل تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پہ پورے اترتے ہوں۔ان فلسفیوں نے تمام مذہبی تصورات اور مابعدالطبعیاتی مزعومات اور دعوؤں کو اس لیے رد کر دیا کہ وہ نہ تو ان کے مذکورہ معیار پہ پورے اترتے ہیں اور نہ ہی وہ ان کی سمجھ میں آتے ہیں۔

ڈیکارٹ نے اپنے فلسفے کی بنیاد اس پہ رکھی کہ ''میں سوچتا ہوں اس لیے کہ میں ہوں''
یعنی (I Think therefore I am)۔ڈیکارٹ کے اس فلسفے نے نہ جانے کیوں اہل مغرب میں بہت مقبولیت حاصل کی اور انھوں نے اس نظریہ کو جدید مغربی فلسفے کی بنیاد قرار دے دیا۔دوسرے لفظوں میں اس نے کہا کہ خودی کا شعوری عمل (Conscious Act of Ego) سچائی تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے پھر خالق کے وجود کے ہر احساس سے عاری مفکرین کا پورا قافلہ اہل مغرب کو اس آزادی کا سبق پڑھانے لگا جو مادر پدر آزاد ہو اور جس کے دریچوں سے کسی مذہبی تصور کا گذر نہ ہو، پاسکل مانسٹیکو، ڈیڈارٹ، وسلی، ہیوم اور والٹیئر جیسے کتنے ہی بے دانش ''اہل دانش'' نے عقل کی لامحدود بالا دستی اور واحد سرچشمہ علم ہونے کے تصور کو عام کیا۔یہ افکار عقل پرستی (Rationalism) کہلائی اور انھوں نے جدیدیت کی نئی تعریف یوں کی کہ؛

''جدیدیت وہ روشن خیالی اور انسان دوستی ہے جو کسی بھی ہستی کی بالا دستی اور روایت کو مسترد کرتی ہے اور صرف سائنسی اور عقلی علوم کو ہی تسلیم کرتی ہے۔ہمارے نظریات عقل کی اس محکم بنیاد پہ کھڑے ہیں، جو سچائی کا واحد منبع خود مختار فرد کی عقل کو قرار دیتی ہے''۔

☆☆☆☆☆☆

چنانچہ جدیدیت کی اس نئی تعریف نے اہل مغرب کے ہاں سے خالق کے ہر تصور کو نکال باہر کیا جس کی وجہ سے ان کے ہاں مذہبی محاذ پر الحاد اور تشکیک نے جنم لیا۔ والٹیر جیسے الحاد کے علمبرداروں نے مذہب اور کسی خالق کے وجود سے قطعی انکار کر دیا۔ تو ہیگل جیسے متشکک مذہب کو تسلیم تو کرتے ہیں مگر اسے عقل کے تابع بتاتے ہیں اور مذہبی حقائق کو بھی دیگر عقلی مفروضات کی طرح قابل تغیر قرار دیتے ہیں۔ سیاسی محاذ پہ ان افکار نے انسانی آزادی کے اس تصور کو اجاگر کیا جس نے اہل مغرب کو ہر اس اخلاقی معیار سے گرا کر رکھ دیا جو کسی انسانی معاشرے کے لیے معیار قرار دیا جا سکتا ہو۔ انھوں نے انسانی حقوق کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ تمام تر اخلاقی تصورات پس پشت ڈال دیئے گئے۔ تھامس ہابس نے انسانی حریت، اس کی آزادی فکر اور آزادی رائے کے احترام کے تصورات عام کیے۔ جان لاک نے عوام کو اقتدار اعلیٰ کا سر چشمہ قرار دیا، مانسٹیکو، روسو اور والٹیر نے اس انسانی آزادی کا پرچار کیا جس کی حدود کے متعلق خود ان کے مابین بھی وسیع اختلافات تھے مگر ان سب کے افکار کی مشترکہ اساس ایک ایسے معاشرے کا قیام تھا جو کسی خالق کے وجود سے بے پرواہ ہو۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ انھوں نے وہ معاشرہ قائم کر دکھایا جس کی وجوہات چاہے جو بھی ہوں سب سے بڑی وجہ جو مجھے نظر آتی ہے وہ ہے اخلاقی حدود و قیود سے آزادی جس نے ان کو جنس کی اس راہ پہ ڈال دیا جہاں انسان محض ایک جنسی حیوان بن کے رہ گیا۔

مذہب اور فلسفہ

یہی وہ دور تھا جب انسانوں کے ایک گروہ نے شعوری طور پہ مذہب سے بغاوت کا نظریہ اپنایا کہ اُن کا خیال تھا مذہبی نظریات چونکہ عقلی اساس پہ استوار نہیں ہوتیں اس لیے لوگوں کو عقل کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں کا تعین کرنا چاہیے۔اس تحریک کو چونکہ بہت سے صاحب عقل و دانش لوگوں کی پشت پناہی بھی حاصل ہوگئی اس لیے لوگوں نے اس نظریہ زیست کو اپنا لیا۔اسی کو خرد افروزی کی تحریک کہا جاتا ہے۔فرانس میں ''Kamoo s'' نے انگلستان میں ''Gubban'' اور ''Hehoom'' نے اعلانیہ روایتی مذہب کے خلاف آواز بلند کی اور خدا روح اور حیات بعد موت کا برملا انکار کیا۔وہ سائنس کی روشنی میں ایک نیا مذہب وضع کرنا چاہتے تھے جو الہام اور وحی سے مبّرا ہو۔(۷) روسو ہی سے خرد دشمنی کی روایت کا آغاز ہوا جس کی ترجمانی بعد میں فختے ، نطشے ،شوپن ہائر اور برگساں جیسے بڑے اہل دانش نے کی۔اہل مذہب اور مثالیت پسند قدم قدم پر سائنس اور مادیت کی مخالفت کرتے رہے۔نشاۃ الثانیہ کی صدیوں میں کلیسا نے سائنس کی اشاعت کو روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔تحریک اصلاح کلیسا بھی نشاۃ الثانیہ ہی کی

ایک فرع تھی جس نے پاپائے روم کے ذہنی استبداد کا جوا اتار پھینکا۔ پھر سائنس کی ترویج اور اصلاح کلیسا کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے احتساب کا محکمہ قائم کیا گیا اور یسوعیوں نے بجبر و اکراہ تحقیقی علوم کے استیصال کی کوشش کی۔ لیکن اب سائنس کے رواج و قبول کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی کلیسا کا جبر کم ہوا اور سترہویں صدی اہم انکشافات اور ایجادات کی صدی بن گئی۔ اٹھارویں صدی کی تحریک خرد افروزی سائنس کے فروغ کا منطقی نتیجہ تھی۔ قاموسی خردمندوں کی تحریریں بڑی مقبول ہوئیں۔ خرد افروزی کے ہمہ گیر اثرات کو زائل کرنے کا بیڑہ جرمن فلسفی Cont نے اٹھایا جو روسو کا بہت بڑا مداح تھا اور جسے جرمن رومانیت کا باپ سمجھا جاتا ہے۔

جرمن رومانیت پسندوں کو روسو کے روحانی بچے کہا کرتے۔ رومانیت کے دو بڑے اجزائے ترکیبی یہ ہیں ۔اول خرد دشمنی، دوم انا پرستی یا فردیت۔ رومانی ادب میں جذبات اور احساسات کے بے محابہ اظہار پر زور دیا گیا ہے اور وہ کلاسیکی ادب کی اسلوبی بندشوں سے باغی تھے۔ چنانچہ گوئٹے، شلر، لسنگ، ہرڈر، بائرن، وڈز ورتھ اور شیلے کا شمار رومانیت کے مشہور شارحین میں کیا جاتا ہے۔ فلسفے میں اس کی ترجمانی موضوعیت اُنا پرستی اور خرد دشمنی کی صورت میں کی گئی۔ تحریک رومانیت کا فکری پس منظر یہ ہے کہ قدمائے یونان انسان کو مرکز کائنات سمجھتے تھے کیونکہ بطلیموسی نظام ہیئت کی رو سے سورج کرہ ارض کے گرد گھومتا ہے جب کہ کوپرنیکس نے ثابت کر دیا کہ کرہ ارض کائنات کا مرکز نہیں بلکہ نظام شمسی کا ایک حقیر سیارہ ہے تو انسان کی اُنا کو سخت ٹھیس لگی اس ذہنی صدمے کے اندمال کے لیے ایک رومانی فلسفہ وجود میں آیا کہ کائنات کا وجودِ متعلق یا شعورِ متعلق واحد حقیقت ہے جو انسان کے ذہنی شعور سے معنوی مماثلت رکھتا ہے۔ اس طرح گویا شعور کے حوالے سے دوبارہ انسان کو ہی مرکز کائنات قرار دے دیا گیا۔

جرمن مثالیت پسندوں نے اس دلیل کو انتہا تک پہنچا دیا(well deurant) نے لکھا ہے کہ کانٹ سے قبل ہی ایک بشپ بارکلے نے مذہبی نقطہ نظر کو تقویت دینے کے لیے کہا تھا کہ کائنات میں صرف مدرکات موجود ہیں اور مادے کا کوئی وجود نہیں۔ پھر بارکلے کی طرح Cont نے بھی مثالیت کے حوالے سے مذہبی اعتقادات کی بحالی کی کوشش کی۔ کانٹ نے قدمائے یونان کی طرح ظاہری عالم اور حقیقی عالم کی تفریق کی۔ اس کے خیال میں زمان و مکاں کا عالم جس سے سائنس کا رابطہ ہے عالم ظواہر ہے مگر عالم حقیقی تک رسائی پانا خرد یا سائنس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ عقل و خرد جب عالم حقیقی کے بارے میں سوچنا

چاہتی ہے تو تضاد کا شکار ہو جاتی ہے۔ راز یہ ہے کہ عالم حقیقی صرف اہل مذہب ہی پر منکشف ہو سکتا ہے اور ہم ذات خداوندی قدر و اختیار اور بقائے روح کی توثیق عقلی استدلالی سے کر ہی نہیں سکتے۔ اس مقصد کے لیے اخلاقی وجدان کو بروئے کار لانا لازم ہوگا۔ تمام اہل مذہب کی طرح کانٹ نے بھی سائنس کی جبریت کو یہ کہہ کے رد کر دیا کہ کسی بھی اخلاقی عامل کے لیے ذی اختیار ہونا ضروری ہے۔ کانٹ کا نظریہ بنیادی طور پہ مثالیاتی ہے لیکن وہ مثالیت پسند کہلوانا پسند نہیں کرتا اور اپنے فلسفے کو تنقیدی فلسفہ کہتا ہے Cont کو لاادری (Agnostic) بھی کہا گیا ہے۔

کیونکہ اس کے خیال میں عقل کی رسائی حقیقت نفس الامری تک نہیں ہو سکتی وہ کہتا ہے کہ ہمارے ذہن کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ہم حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ کانٹ نے دے کارت کی موضوعیت کو قبول کر لیا اور کہا کہ زمان و مکاں کا کوئی معروضی وجود نہیں ہو سکتا یہ تصور ہمارے ذہن نے خلق کیا ہے اور اس کے وجود کا انحصار ذہن پر ہی ہے۔ کانٹ کی رومانی مثالیت پسندی اور مذہب میں بہت سے اساسی اصول مشترک ہیں۔ مثلاً کانٹ نے ذات باری تعالیٰ اور روح کے وجودِ بقاء اور قدر و اختیار کے بارے میں دلائل دیئے ہیں اور دونوں میں اخلاقی وجدان کو ادراکِ حقیقت کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

کانٹ کی لاادریت وہی ہے جو اہل مغرب کی خرد دشمنی سے متبادر ہوتی ہے اس نے یہ کہہ کر مذہب کو تقویت دی کہ حقیقت نفس الامری کا انکشاف عقل و خرد پر نہیں ہوتا۔ اس نے اہل مذہب کی طرح عالم ظواہر اور عالم حقیقی میں فرق کیا اور کہا کہ حقیقی عالم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سائنس کا طریق تحقیق ناکام رہتا ہے جب کہ مذہبی وجدان اسے پالیتا ہے۔ پھر دونوں کا الٰہیاتی نظریہ تشبیہی ہے۔ مذہب میں خدا کو انسانی شکل و صورت اور احساس و جذبہ پر قیاس کیا گیا ہے مگر کانٹ کی مثالیت پسندی میں کائنات کو انسان پر قیاس کیا گیا ہے وہ کہتا ہے کہ کائنات بھی انسان کی طرح ذہن و احساس سے مزین ہے اور کائناتی ذہن اور انسانی ذہن دونوں واحد النوع ہیں۔ تاہم کانٹ کا جو نظریہ "تنقید عقل محض" میں پیش کیا گیا ہے اسے موضوعی مثالیت کہنا زیادہ قرین صحت ہوگا قدمائے یونان کی مثالیت پسندی اور جرمنی کے رومانی فلاسفہ کی مثالیت پسندی میں فرق ہے۔ یونان کے مثالیت پسند فلاسفہ افلاطون اور ارسطو وغیرہ عقل استدلالی پر محکم یقین رکھتے ہیں۔ افلاطون اور پارمی نائدس کا ادِعا یہ ہے کہ صرف عقل اور استدلال ہی عالم حقیقی تک رسائی حاصل کر سکتی ہے اس کے برعکس کانٹ عقل استدلالی کو چنداں اہمیت دینے کے لیے

تیار نہیں اس لیے کہ وہ ادراکِ حقیقت سے قاصر ہے اس طرح کانٹ کے واسطے سے رومانی فلسفے میں خرد دشمنی نے بار پایا۔ کانٹ کی مثالیاتی روایت کی ترجمانی فختے، شیلنگ اور ہیگل نے کی ہے لیکن ایک امر خاص میں انھوں نے کانٹ کے نظریہ سے انحراف کی راہ اپنائی ہے۔ انھوں نے کانٹ کی لاادریت کو رد کر دیا اور کہا کہ عقل انسانی حقیقت نفس الامری کو جاننے پر قادر ہے۔ (۸) وہ کہتے ہیں کہ حقیقت کامل و اکمل وحدت ہے جس کا ادراک صرف عقل استدلالی ہی کر سکتی ہے۔ انھوں نے بھی روح متعلق، وجود متعلق یا عین متعلق کو خدا کہا ہے۔ فختے کا وجود مطلق اخلاقی ہے شیلنگ کا جمالیاتی اور ہیگل کا عقلیاتی ہے۔ اس اختلاف کے باوصف فلسفیانہ وحدت الوجود ان میں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے۔ فختے نے وجود متعلق کو اَنائے مطلق کہا ہے جو روحانی الاصل ہے۔ غیر شخصی فعلیت ہے اور کائنات میں ہر کہیں جاری و ساری ہے اور تمام اَناؤں کا مبدا اور ماخذ بھی وہی ہے۔

فختے کہتا ہے کہ حقیقی وجود اَنا کا ہے۔ عالم مادی جو ہمیں بظاہر دکھائی دیتا ہے اسے اَنائے مطلق نے ہی خلق کیا ہے تاکہ اس سے پیکار آزما ہو کر وہ اپنی تکمیل کر سکے۔ فختے کے اس نظریے میں مثالیت پسندی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ کائنات کی اصل ذہن ہے۔ روحانی ہے، فختے نے کائنات میں ذہن اور مادے کی دوئی سے انکار کیا ہے اور کائنات سے مادے کو یکسر خارج کر دیا ہے کہ کائنات فی الاصل ذہن ہے۔ اَنا ہے، خدا ہے، فختے کا فلسفہ مثالیاتی انداز میں مذہب کی توثیق کرتا ہے اور صوفیانہ وحدت الاوجود کی یاد دلاتا ہے۔

فختے بھی اہل مذہب کی طرح انسانی قدر و اختیار اور روح کی بقاء کا قائل ہے۔ البتہ اس کے خیال میں وہی روح یا اَنا باقی رہے گی جو فطرت کے خلاف نبرد آزما ہو کر توانا ہو جائے گی اور یہ پیہم کشمکش ہی روح کو غیر فانی بنا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں اقبال نے فختے کے اس فلسفے کو خودی کے نام سے اسلام کا جامہ پہنایا۔ شیلنگ بھی فلسفیانہ رومانیت کا شارح ہے اس کا وجودِ مطلق جمالیاتی ہے اور اس کا تصور کائنات یہ ہے کہ کائنات ایک نہایت حسین و جمیل فن پارہ ہے جو ایک اعلیٰ فنکار کی صناعی اور اہلیت کا ثبوت ہے۔ یہی نقطہ نظر ''گوئٹے، شلر اور وڈز ورتھ'' وغیرہ رومان پسندوں کا بھی تھا۔ البتہ شیلنگ کے فلسفے کو وحدت الوجود بھی کہا گیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں وجود مرئی روح ہے جب کہ نیچر غیر مرئی روح ہے۔ اسی خیال کو وڈز ورتھ، لسنگ اور ہرڈر وغیرہ نے آگے بڑھایا جس سے رومانیوں نے کسب فیض کیا۔ انھوں نے نیچر کو

ذی حیات اور ذی روح کہا اور پھر اس سے ذہنی و قلبی رابطہ قائم کرنے کی دعوت دی۔ آخری عمر میں شیلنگ پکا صوفی بن گیا تھا اور کہنے لگا تھا کہ روح بالآخر روح مطلق میں فنا ہو جاتی ہے۔ ہیگل اوائل عمری میں تصوف کی جانب مائل تھا وہ روسو اور کانٹ کے نظریہ کائنات سے خاص طور پہ متاثر تھا۔ اس نے تصوف سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وجودِ متعلق کے علاوہ جو شئے بھی ہے وہ غیر حقیقی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سوائے کُل کے کوئی حقیقی شئے نہیں ہو سکتی۔ اس کے فلسفہ میں کائناتِ ذہن کا ارتقاء نیچر کی طرف ہے جو اعمال انسانی ذہن میں وارد ہوتے ہیں وہی نیچر میں بھی واقع ہوتے ہیں۔ نیچر میں یہ عمل لاشعوری طور پہ ہوتا ہے۔ جیسے مثلاً بیج کا پھول بن جانا، انسان میں یہ عمل شعوری ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ارتقاء کے مراحل سے گذر رہا ہے۔ چنانچہ ہیگل کی کائنات "وہ کُل" ہے جو ایک فکری عمل ہے اور کسی فکری عمل ہی کی طرح ارتقاء پذیر ہے اور اسی کو کامل مثالیت کہا جاتا ہے۔

اس کل میں جدلیاتی عمل جاری ہے یعنی مثبت منفی اور اتحاد کا عمل جس میں قدریں محفوظ رہتی ہیں۔ یہ عمل افکار میں جاری ہے لہٰذا کائنات بھی اصلاً فکری ہے اور فکری قوانین کے تحت ہی ارتقاء پذیر ہے۔ کُل نیچر اور انسان دونوں کو محیط ہے۔ بعد کے ادوار میں ہیگل کے اس فلسفہ کائنات کی اس کے شاگردوں نے مزید تشریح کی۔ ہیگل کے پیروؤں میں بریڈلے، رائس، کروچے، جنٹلے اور اویکن کو شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے اس فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا کہ مادہ ذہن کی تخلیق ہے اور اپنے وجود کے لیے ذہن ہی کا محتاج ہے۔

ہیگل اور اس کے پیرو عقلیت پسند ہیں یعنی ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عقل استدلالی مشاہدے اور حسی تجربے کے بغیر بذات خود صداقت کا انکشاف کر سکتی ہے۔ مثالیت پسندی کے اس پہلو سے بھی مذہب کی تائید و توثیق کا کام لیا گیا ہے۔ چونکہ مذہب کی صداقتیں بھی انسانی تجربے سے ماوراء ہوتی ہیں اس لیے ہیگل کے ناقدین ہربارٹ، ولیم جیمز اور فوئرباخ وغیرہ کہتے ہیں کہ عقلیاتی استدلال کے لیے بہرحال کسی بنیاد کی ضرورت ہے جس کے بغیر مجرد عقل استدلالی انسانی تجربے سے ماوراء ہو کر کوئی موضوع فراہم نہیں کر سکتی۔ علم کے دو پہلو ہیں ہیت اور موضوع مگر عقلیت پسند صرف ہیت سے اعتناء کرتے ہیں۔ لیکن ہیت بغیر موضوع کے کھوکھلی ہے جیسے موضوع کے بغیر ہیت انتشارِ محض ہے۔ مگر علم نہ کھوکھلا ہے نہ انتشار، اس لیے تجربہ اور مشاہدہ موضوع فراہم کرتے ہیں اور عقل استدلالی اس میں نظم قائم کرتی ہے اور تجربہ اور عقل

مل کرہی کسی موضوع کو منظّم کرتے ہیں اور علم اسی تنظیم کا دوسرا نام ہے۔یونانِ قدیم میں سوفسطائیوں نے حیات کے حق میں بات کی تھی اور کہا تھا کہ انسان حسی تجربے کے واسطے سے ہی علم حاصل کرسکتا ہے۔تاہم جدید دور میں بیکن ،لاک ،ہربارٹ ،آگسٹس ،کونٹ اور ولیم جیمز وغیرہ نے اس فکری رویے کے حق میں دلائل دیئے ہیں اور تجربیت ،نتائجیت ، ایجابیت اور حقیقت پسندی کی تحریکوں کی آبیاری کی جس سے بالواسطہ سائنس کے نقطہ نظر کو تقویت پہنچی۔

ہیگل کے فلسفے میں کائنات ارتقائی عمل ہے جس میں خدا عقل محرک کی حیثیت رکھتا ہے اور کائنات کے ارتقائی عمل میں شریک ہے۔اس پہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ہیگل کا خدا اگر شروع ہی سے کامل واکمل تھا تو ارتقاء کے عمل میں کیسے شریک ہوا۔اور اگر وہ کائنات کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ صورت پذیر ہورہا تھا تو اسے کامل کیسے کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہیگل اور اس کے متبعین کائنات کو ایک عظیم ذات تصور کرتے ہیں جس کی ماہیت ذہنی ہے اور وہ اس کائنات کو بامعنی کہتے ہیں۔یعنی اس میں ایسے اشارات موجود ہیں جو معروضی صورت میں موجود ہیں۔اگر ان معروضی معانی کو تسلیم کرلیا جائے تو یقیناً کسی نہ کسی نوع کی ذہنی حیات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

اہل مذہب بھی کائنات میں معروضی قدروں کو مانتے ہیں اور ان کے حوالے سے خدا کے وجود کا اثبات کرتے ہیں۔ پھر جرمن فلاسفر ایوکن اور برطانوی سکالر جیمز وارڈ نے جرمن مثالیت کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھایا کہ ہیگل اور اس کے متبعین کے وجودِ متعلق یا روح کل کو مذہب کا خدا تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ کوئی ذی ارادہ اور قادرِ مطلق ہستی نہ تھی۔مزید براں یہ وجودِ مطلق کائنات سے ماوراء نہیں بلکہ اس میں جاری وساری ہے۔مگر اس فلسفہ سے مذہب کے شخصی خدا کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اگر اسے کائنات میں جاری وساری تسلیم کیا جائے تو خدا کائنات کا خالق نہیں رہے گا نہ وہ اس میں تغیر وتبدل کرنے پر قدرت رکھے گا۔مذہب کے خدا کے لیے دو شرائط کا ہونا لازمی ہے،ایک یہ کہ وہ ایک ذی ارادہ ہستی ہو اور دوسرا یہ کہ وہ کائنات سے ماوراء ہو۔برطانوی فلاسفر ”Latsa“ اور ”James Ward“ نے اس دِقت کو یہ کہہ کر رفع کرنے کی کوشش کی کہ خدا کائنات میں جاری وساری بھی ہے اور اس سے ماوراء بھی ہے۔خدا کو ماوراء کہہ کر وہ خدا کو خالق منوانا چاہتے ہیں اور اسے طاری وساری کہہ کر اسے اعمال کائنات اور انسان کے عمل ارتقاء میں شامل بھی کرنا چاہتے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا

کائنات سے ماوراء ہوکر اس میں جاری ساری نہیں رہ سکتا اس لیے کہ یہ امر محالاتِ قطعی میں سے ہے اور منطق کی رو سے اسے اجتماع المغائرین کہا جاتا ہے۔ جرمن رومانی فلاسفہ اور ان کے متبعین کے افکار و انظار سے اہل مذہب نے اپنے عقائد کی توثیق کا کام لیا ہے اور ایک نیا علم کلام مرتب کر دکھایا ہے یہودیوں میں بیوبر ہندوؤں میں آندرو گھوش اور مسلمانوں میں اقبال ہمارے دور کے متکلمین ہیں۔

مذہب کی تاریخ

اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کسی بھی دور کا انسان مذہب یعنی خدا کے تصور سے خالی نہیں رہا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنی شعوری ناپختگی اور نام نہاد فلاسفہ کے آڑے ترچھے نظریات کے سائے میں زندگی اور مذہب کے درمیان وہ توافق قائم نہ کر سکا جو وقت کی ضرورت تھی۔ اگرچہ وہ ایک ایسے خالق کی تلاش میں انتہائی جذباتی تھا جو اس کے لیے زندگی کی راہیں روشن کر دے۔ مگر ایک کثیر وقت تک انسان خالق کے حقیقی ادراک سے قاصر رہا۔ وہ توہم اور اپنے آباء کی روایت کے سامنے کسی اور چیز کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس مضمون میں ہم مذہب کی حقیقی ماہیت سے بحث کرنے کی بجائے مختلف ادوار کے اہل دانش کی رائے اور ان کے علاقائی رسم و رواج پہ مشتمل ان نظریات اور روایات سے بحث کریں گے جن کو قدیم زمانہ کے لوگ مذہب قرار دیئے ہوئے تھے۔ یاد رہے کہ بیان کیے جانے والے تمام خیالات حقیقت سے دور مادیت سے آلودہ ایسے نظریات ہیں جن میں ملحدانہ خیالات سمیت فلاسفہ کے وہ سب

تصورات شامل ہیں جوانھوں نے کسی بھی دور میں مذہب کی تعبیر کرتے ہوئے اختیار کیے۔ان میں غالب اکثریت یونانی افکار سے متاثر نظر آتی ہے،حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے مذہب کی جو سوغات اقوامِ عالم کو بخشی ہے اس کا حقیقی ادراک تبھی حاصل ہوسکتا ہے جب انسان جانے کہ لوگ مذہب کے نام پر کن کن اندھیری راہوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرے ہیں۔روشنی کا احساس اندھیرے میں اور جہل کا ادراک علم سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں لوگوں کی ان آبادیوں کا تذکرہ ہے جو اپنے آباء کی روایات سے اس طرح چمٹے ہوئے تھے کہ کوئی دلیل ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ یہ ان وقتوں کا ذکر ہے جب انسان ابھی صنعتی اور سائنسی ادراک وفہم سے دور بہ مشکل اپنے بقاء کی جنگ سے باہر آیا تھا اور اپنے سماج کی دیواریں چننے میں مصروف تھا اس لیے لامحالہ اس کے مذہبی تصورات بھی اتنے ہی ناپختہ تھے جتنے کہ ان کے سماجی رویے ،مذہب کی تشکیل و تدوین کیسے عمل میں آئی اس بارے میں اہل علم کے ہاں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ایک مغربی مفکر(EB Tayler) کہتا ہے کہ دیو مالا اور جادو کی طرح مذہب بھی روحوں کے مت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

ذہن وشعور کی نشو ونما سے قدیم پتھر کے دور کے انسان کی غور وفکر کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں تو اس نے قدرتی مظاہر کو سمجھنے کے لیے قیاس آرائیاں شروع کیں۔اس دور کے انسان کے خیالات اور احساسات کا تجزیہ معاصر وحشی اقوام کے مطالعے و مشاہدے اور نفسیاتِ طفلی کی روشنی میں کیا گیا ہے ۔چنانچہ (Tayler) کہتا ہے کہ پہلے پہل نیند خواب موت اور دوسرے حوادث پہ غور کرتے ہوئے انسانی ذہن میں روح کا تصور جاگزیں ہوا۔جب وہ دیکھتا کہ وہ دور دراز کے جنگلوں میں شکار کھیلتا پھر رہا ہے اور اپنے مرے ہوئے ساتھیوں سے ملاقاتیں کر رہا ہے تو وہ سوچنے لگا کہ اس کے اندر کوئی ایسی شے ضرور موجود ہے جو اس کے بدن سے الگ بھی ہو جاتی ہے اور دوبارہ جسم میں واپس بھی آجاتی ہے۔دن بھر کی مشقت سے تھک ہار کے جب وہ سوتا تو خواب اسے نگر نگر لیے پھرتے اور وہ اپنے ان دوستوں سے بھی مل لیتا جنہیں کب سے موت کا عفریت نگل چکا تھا۔اس امر سے قدرتاً اس کے ذہن میں یہ تصور راسخ ہوا کہ انسان مر کے مٹ نہیں جاتا بلکہ ان کے اردگرد ہی کہیں بھٹکتا رہتا ہے۔(Tyaler)کے خیال میں روح کے تصور اور اس کی بقاء اور حیات بعد موت کا یہی خیال بعد میں مذہب کا سنگِ بنیاد بن گیا۔قدیم زمانے کا انسان اپنے مرے ہوئے آباؤ اجداد کو زندہ تصور کر کے ان کی دعوت بھی کیا کرتا۔چنانچہ مردوں کی

روحوں کی دعوت کا یہ سلسلہ آج تک دنیا کی کئی اقوام میں باقی ہے۔ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسانی ذہن کی ایک معروف خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات کو اپنے لاشعور میں ہمیشہ مرتب و مدون کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ مرورِ زمانہ سے قدیم دور کے انسان نے بے شمار ذی روح ہستیوں اور اشیاء میں سے چند بڑی بڑی ہستیاں منتخب کر لیں اور انھیں دیوتا بنا کر پوجنے لگا۔ شکار کا دور گذرا اور انسان کاشت کاری کی طرف راغب ہوا تو جہاں اس کے اندر بے پناہ سماجی تبدیلیاں در آئیں وہیں اس کے عقائد بھی ارتقاء کا سفر طے کرتے رہے۔ زرعی انقلاب کے ساتھ جب اس کے پیداواری ذرائع بدل گئے تو اس کے معبود بھی بدل گئے۔ اب وہ بارش برسانے اور ہریالی لانے والی قوتوں کا پجاری تھا۔ شکار کے دور کا انسان فطری طور پہ بہت آزاد تھا۔ وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا اور جہاں اس کا جی چاہتا پڑا رہتا۔ مگر جب انسان نے کاشت کاری کی بنا رکھی تو اب اس کو اپنی فصلوں کی حفاظت کے لیے ان کے پاس رہنا پڑا۔ چنانچہ لوگ مل کے رہنے لگے اور اولین سماجی ڈھانچے کے خدوخال وضع ہونے لگے، لوگ دھرتی سے وابستہ ہو گئے جس سے مختلف قبائل کی تدوین عمل میں آئی جو سیاست کی نمود کے ساتھ شہنشاہیت کی صورت اختیار کر گئی۔

اگر چہ قبیلہ کا سربراہ اب بھی سردار ہی تھا مگر وہ شاہ کا وفادار تھا۔ اس لیے سارے سردار بادشاہوں کے تحت آ گئے۔ پھر بادشاہ کو آقا یعنی (خداوند خدا یا اس کا اوتار) بھی کہا جانے لگا اور بنی نوع انسان نے کثرت پرستی سے دوئی اختیار کی۔ تثلیث اور توحید کی جانب اپنے قدم بڑھائے۔ ایک اور مغربی مورخ (W Rijway) نے کہا کہ مذہب روحوں کا نہیں بلکہ مردوں کا مت ہے اور یہ نظریہ پیش کیا کہ ابتدا میں لوگ دیوتاؤں کی نہیں بلکہ اپنے مرے ہوئے پرکھوں (آباؤ اجداد) کی پوجا کیا کرتے تھے۔ دیوتاؤں کا ظہور بعد میں ہوا۔ دیوتا شروع شروع میں پرکھوں کی روحیں ہی تھے جن پہ فوق الطبع کا رنگ چڑھا دیا گیا تھا۔ تاہم (Frezer) نے ٹوٹم مت کے حوالے سے مذہب کی توجیہ کی ہے۔ ٹوٹم مت آج بھی آسٹریلیا، افریقہ اور بحرالکاہل کے بعض وحشی قبائل میں موجود ہے۔ جب کسی قبیلے کے افراد اپنے آپ کو کسی جانور یا درخت سے منسوب کر لیتے تو اسے اپنا بھائی یا آسمانی باپ قرار دے لیتے۔ وہ اسے جان سے مارنا یا کاٹنا بڑا گناہ تصور کرتے۔ چنانچہ ان کا منتخب کردہ وہ درخت یا جانور ان کا دیوتا یا ٹوٹم بن جاتا۔ فریزر کے مطابق ٹوٹم کی اصطلاح سب سے پہلے ایک انگریز جے لانگ نے سولھویں صدی میں لال ہندیوں سے سیکھی

۔ایک اور مغربی مفکر(Mac lanon) نے بھی (J-G Frezer) کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہب ٹوٹم مت ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔جب کہ ٹائلر نے ٹوٹم کا رشتہ پرکھوں کی روحوں کی پوجا سے جوڑا اور کہا کہ وحشیوں کے عقیدے کے مطابق ان کے پرکھوں کی ارواح نے حیوانوں پرندوں اور پودوں وغیرہ کو اپنا مسکن بنایا تھا اس لیے انھیں مارنا یا کاٹنا ممنوع ہے۔ ہندوستان کے کچھ علاقوں میں بھی ٹوٹم مت کے ثبوت ملے ہیں۔درختوں کو نہ کاٹنا اور جانوروں کو نہ مارنے کے اصول کو اس مذہبی تصور کے لوگ اپنا سماجی قانون قرار دیتے تھے جس کا نام انھوں نے "ٹیبو" رکھا تھا۔ہندوستان کے ناگا اسی ٹیبو کو گِنا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ٹیبو کا لفظی معنیٰ یہ ہے کہ ایسا امتناع جسے مذہب نے تقدس فراہم کیا ہو(۱۴)۔

چنانچہ ٹیبو وہ قدیم ترین غیر تحریر شدہ مذہبی قانون ہے جس کی پابندی اس معاشرے کے لیے لازمی قرار دی گئی تھی۔(Roberat Semieth) نے بھی تقدس کے حوالے سے ٹیبو کے قوانین کی تشریح کی ہے۔ان کے خیال میں مقدس کے دو پہلو ہیں مثبت اور منفی، پاک اور آلودہ، عارفانہ اور شیطانی۔اسی طرح (Fraied) نے بھی اپنی کتاب (Totam and Taboos) میں ان قوانین کو قدرے وضاحت سے بیان کیا ہے۔اس نے کہا کہ جب قدیم زمانے میں بیٹوں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور اسے مل کے کھا گئے تو ان میں ایک احساسِ جرم پیدا ہوا جس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے محرمات سے اختلاط اور ماں باپ کو مارنا ممنوع کر لیا۔یہیں سے اولین اخلاقی قدروں کا آغاز ہوا۔تاہم دوسرے بہت سے مذہبی مفکرین نے (Fraied) کی اس تشریح کو دور از کار قرار دیا ہے اور اس کے رد میں سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔

ان کا تصور یہ ہے کہ ٹوٹم مت کے زمانے میں مادری معاشرہ تھا جس میں باپ کو کوئی خاص اہمیت ہی حاصل نہ تھی اس لیے ایسے کسی معاشرے میں اس طرح کی کسی نفسیاتی الجھن کا خیال محض ایک مفروضہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔آج بھی جہاں کہیں ٹوٹم کے پیرو وحشی قبائل پائے جاتے ہیں وہاں کے اخلاق اور معاشرے کو ٹوٹم اور ٹیبو ہی کی بنا پر منظّم کیا گیا ہے۔ان کے ہاں کسی جانور یا درخت کو ٹوٹم بنا لیا جاتا اور اسے وہ اپنا باپ تصور لگتے۔اس لیے کہ ان کے ہاں یہ خیال پختہ ہے کہ ان کے ٹوٹم میں ان کے پدرِ اعلیٰ کی روح نے حلول کیا ہے۔ان کے ٹوٹم کے نشانات ان کی کھجوروں پہ کھدے ہیں جن کی وہ بتوں کی طرح

پوجا کرتے، وہ ان کو سجدہ کرتے اور ان پہ قربانیاں چڑھاتے۔(Agestas kont) نے مذہب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا کہ مذہب کی ابتدا اشیاء پرستی سے ہوئی اور ان چیزوں میں عموماً پراسرار قسم کی طلسماتی قوت ضرور ہوتی۔(Herberat Spensar) نے کہا کہ مذہب کا آغاز پرکھوں کے بھوتوں کی پوجا سے ہوا کہ لوگ اس سے خائف تھے۔ان کے خیال میں اگر ان ارواح کی پرواہ نہ کی جائے تو وہ انسان کے لیے خطرہ ہوسکتی ہیں۔تاہم اگر ان کو راضی رکھنے کی کوشش کی جائے تو وہ انسان کی مدد بھی کرتی ہیں۔ایک جرمن مفکر(E - Sakey) نے ستارہ پرستی کو مذہب کا مآخذ قرار دیا ہے۔اس کے مطابق دیو مالا اور مذہب شروع سے ستاروں کی پوجا سے وابستہ رہے ہیں جن کا مرکز شہرِ بابل تھا۔اس کی اشاعت مشرق وسطیٰ کے ممالک سے عرب یونان اور اسرائیل میں ہوئی تھی شاید اسی لیے اسے (E- Askey) نے ہمہ گیر بابلیت کا نام دیا۔(Robert Samith) نے قربانی کو مذہب کا نقشِ اولیں کہا۔

اس کے خیال میں جب قدیم زمانے کا انسان اپنے آباء کی روحوں کی تسکین یا اپنے تصوراتی دیوتاؤں کو خوش کرنا چاہتا تو قربانی کرتا۔اسی سے مذاہبِ عالم کا آغاز ہوا۔مانا کے تصور سے بھی مذہب کی تشریح کی گئی ہے۔میلانیشیوں کے ہاں عالم ارواح کے لیے مانا کا لفظ ہے۔وہ مانا کو ایک قسم کی توانائی خیال کرتے تھے جو کائنات میں ہر کہیں مخفی ہے۔جو ہماری صحت اعمال اور خوشحالی پر اثر انداز ہوتی ہے۔اس غیر مرئی اور غیر شخصی توانائی کو جو بعض اوقات مختلف اشخاص یا اشیاء میں حلول کر کے انھیں مقدس یا بابرکت بنا دیتی۔شمالی امریکہ میں روانڈا کے مکین اسی مخفی توانائی کو مانیٹو کہتے۔مراکو(مراکش) میں اسے برکہ کہا جاتا۔اہل مراکش کا خیال تھا کہ یہ توانائی ان کے سلاطین اولیاء سادات اور مجذوبوں سے خاص ہے۔جنوبی ہند میں اسے یعنی مانا کو شکتی کہا جاتا۔وہ مانا کی تقسیم کے قائل تھے اور ان کے خیال میں شکتی بری بھی ہوتی ہے جو آزار پہنچاتی ہے اور اچھی بھی ہوتی ہے جو خوشحالی لاتی ہے۔اڑیسہ کے وحشی قبائل مانا کو ''بوانگا'' کہا کرتے (Robert Samith) کے خیال میں مانا کا تصور اول اول مقدس ضیافت (قربانی) ہی سے پیدا ہوا۔اس لیے کہ بعض قبیلوں کے لوگ اپنے ٹوٹم کو مار کر کھا جاتے تھے تا کہ اس کی طلسماتی پراسرار توانائی ان میں حلول کر جائے۔(Goderngten) نے میلانیشی معاشرے کے حوالے سے مانا کے تصور پہ تفصیلی بحث کی ہے اور اشارتاً کہا ہے کہ یہی ہمہ گیر توانائی ہے جس کو بعد میں

مذہب اور روحانیت قرار دے دیا گیا جو آج تک مذہب کے حوالے سے ایک مضبوط جواز تصور کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف علم الانسان کے طلبہ نے خدا کے تصور کو تشبیہی ''Anthropomorph'' قرار دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اپنے نمونے پر خلق نہیں کیا جیسا کہ اہل مذہب کہتے ہیں۔ بلکہ انسان نے خدا کو اپنے نمونے پر خلق کیا ہے گویا خدا انسان سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتا اور خالق خود انسانی ذہن ہی کی ایک الجھن ہے۔

(Fried) اور اس کے ہم مسلک اِدعّا کا کہنا ہے کہ مذہب بچپن کے نفسیاتی عدم توازن کے مماثل ہے اور جذبہ مذہبیت دورِ طفلی کے بے بسی کے احساس سے یادگار ہے۔ اس میں بنی نوع انسان کے عہدِ طفلی یا ابتدائی دورِ تہذیب کی بے چارگی کا احساس بھی شامل ہے۔ وہ خدا کو باپ کا عکس مانتے تھے جو دہشت اور شفقت دونوں کا مجموعہ ہے۔ بچہ باپ سے ڈرتا بھی ہے اور اس کا سہارا بھی تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ خدا کا تصور ابوی الجھن کی پیداوار ہے۔ اسی بنا پر خدا کو آسمانی باپ بھی کہتے ہیں (Fried) کا ایک شاگرد (Dr Forsmith) جو اپنے استاد ہی کی طرح ''بے دانش'' ہے مذہب کی تشریح کچھ اس طرح کرتا ہے:

> ''مذہب انسان کو سہارا دیتا ہے لیکن یہ ایسا ہی سہارا ہے جیسا کہ ایک بچہ تلاش کرتا ہے۔ بالغ آدمی کسی کا سہارا لے گا تو یہ اس کی ذہنی ناپختگی اور طفلانہ پن کا ثبوت ہوگا۔ انسان کے لیے خدا کی ذات یا کسی ماورائی طاقت کا سہارا بالکل بے جواز ہے بلکہ انسان کو خود اپنی ذات کا سہارا لینا چاہیے اسے جنت کی تلاش کے بجائے خود اسی دنیا کو جنت بنا لینا چاہیے، اسے موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے بلکہ یہ دنیا ہی جائے تعیش ہے اور مذہب نے یہ جو شقی اور سعید، نیک و بد، صادق و کاذب کی تفریق کی ہے یہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ کوئی شخص فطرتاً اچھا یا برا نہیں ہوتا ماحول اور معاشرہ اسے اچھا یا برا بنا دیتے ہیں اس لیے ماحول کو سازگار بنا کے ہر شخص کو اچھا بنایا جا سکتا ہے''۔

☆☆☆☆☆☆

مگر حیرت ہے کہ (Dr Forsmith) اپنی کتاب (Psychology of Rerligion

) کے آخری صفحے تک یہ راز کھولنے سے گریزاں رہے کہ آخر مذہب کے سوا وہ کون سی اخلاقی اور تہذیبی بنیادیں ہیں جن کو اپنا کر انسان اپنے ماحول کو اتنا سازگار بنا سکے جس میں برائی کا وجود مٹ کے رہ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب کا یہ پورا گروہ جس نے اپنے فلسفے کی ساری عمارت کی بنیاد مادیت پہ رکھی ہے انھوں نے دنیا میں علم کے نام پہ جو اندھیرا پھیلایا ہے اس نے کئی انسانی نسلوں کو روحانی تشنگی کے اس غار میں دھکیل دیا جہاں صرف ناکامی مایوسی ندامت اور پچھتاوے کے سائے ہیں۔

Fried اپنی کتاب (Pleasure Thinking) میں مذہب کے حوالے اپنی دانش کی دہائی کچھ یوں دیتا ہے!

"تحلیل نفسی کی رو سے نفس انسانی کے دو پہلو ہیں ایک حظ فکری اور دوسرا حقیقت فکری۔ مذہب اور تصوف حظ فکری کی پیداوار ہیں جب کہ سائنس حقیقت فکری کی پیداوار ہے۔ حقیقت پسند آدمی خواب وخیال کی دنیا کی بجائے حقائق کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے مسائل اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے چاہے حالات اس کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں۔ اس کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے ہاتھ خلا میں اٹھائے کسی ان دیکھی طاقت سے مدد کا طالب ہو۔ اس کے برعکس مذہبی آدمی وہ ہے جو حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتا اور وہ حقائق سے فرار اختیار کر کے تخیلات سے رجوع لاتا ہے اور تخیل ہی میں اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا مداوا تلاش کرتا ہے۔ مذہب اسی اجتماعی تخیل آرائی کا کرشمہ ہے بنی نوع انسان نے اپنے ابتدائی دور میں بچوں کی طرح نامساعد قدرتی ماحول سے گریز اختیار کرنے کے لیے تخیل آرائی کے دامن میں پناہ لی تھی جو بعد میں عقائد کی شکل اختیار کرنے کے باعث مذہب کی بنیاد بن گیا رفتہ رفتہ انسان زمانے کے تقاضوں اور فکری ارتقاء کے ساتھ بلوغتِ نظر واحساس سے بھی بہرہ یاب ہو گیا اور اپنے عقدے حقیقت پسندانہ انداز میں سلجھانے لگا۔ اب اگرچہ اس کو کسی خارجی طاقت کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی نجانے کیوں وہ

مذہبی تخیلات سے ہی چمٹا رہا تھی کہ صنعت اور سائنس کا دور آ پہنچا اور سائنس کی ترقی نے انسان کی دلچسپیوں کا رخ تخیل آرائی سے ہٹا کر مروضی صداقتوں کی طرف موڑ دیا اور وہ نفسیاتی بلوغت کے مرحلے میں داخل ہو گیا(۱۵)''۔

قدیم مذہبی عقائد

صحیح تاریخ سے مذہب کی تشکیل میں دو عوامل کارفرما رہے ہیں ایک انسان کی معاشیات اور دوسرے اس کی نفسیات کہ بھوک کے خوف اور تشویش کے باعث قدیم زمانے کے انسان کو اپنی بے بسی اور بے چارگی کا نہایت تلخ احساس تھا جس کی تلافی کے لیے اس نے تخیل آرائی میں پناہ ڈھونڈی اور مافوق الطبع عناصر کا سہارا لیا۔ فوق الطبع کا سہارا وہی شخص لیتا ہے جو موت سے ڈرتا ہو یا غریب اور مفلس ہو۔ مذہب کی مقبولیت کا راز اس میں ہے کہ وہ موت کے بعد ایک اچھی زندگی کی بشارت دیتا ہے جس کا سنگ بنیاد روح کے تصور میں تلاشا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس تصور کے ساتھ ہی حیات بعد موت، بقاء و معاد، حشر اجساد ، جزا و سزا، جنت اور دوزخ اور خوفِ خدا کے عقائد وابستہ ہیں۔ کوئی بھی شخص جو روح کے وجود کا منکر ہو بامذہب نہیں ہو سکتا کیونکہ روح کے منکر پر لازم آئے گا کہ وہ موت کے بعد روح کے باقی رہنے سے بھی انکار کرے۔ چنانچہ روح پر عقیدہ رکھنا ہی عالم عقبیٰ پر عقیدہ رکھنا ہے۔ خدا کے وجود پر عقیدہ رکھنا یہ ہے کہ

روح کا منکر لازماً خدا کا بھی انکاری تصور کیا جائے گا۔قدیم زمانے کا انسان سانس یا ہوا کے جھونکے کو روح کہا کرتا تھا۔آج بھی متعدد بڑی زبانوں میں روح کے لیے جو الفاظ مستعمل ہیں وہ سانس یا ہوا کے جھونکے ہی کے ہم معنٰی ہیں۔جیسا کہ عربی میں روح کے لیے نفس عبرانی میں رواح یا نفش، یونانی میں سائیکی، لاطینی میں اپنی ماسنسکرت میں آتما اور انگریزی میں سپرٹ کے لفظ روح کے مقابل زیر استعمال ہیں۔(۱۶) قدیم زمانے کا انسان ارتقاء کے مراحل طے کرتا رہا اور شعور بیداری کے ساتھ اس کے ہاں روح کا تصور بھی بدلتا رہا۔پہلے روح ہوا کا جھونکا یا کسی پراسرار توانائی پر مشتمل تھی۔پھر انسان کے آباء نے روح کو اپنی ہی شکل وصورت اور قد وقامت جیسی چلتی پھرتی کایا سمجھ لیا۔پھر وہ اس کو بھوت پریت سمجھتا رہا جو انسان کی موت کے بعد کسی دوسرے عالم کو چلی جاتی ہے۔اسی کایا سے عفریت، ہمزاد، جن اور بھوت پریت وغیرہ کے تصورات وابستہ ہیں۔یہ روح موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے وہ اپنے عزیزوں کی مدد کرتی ہے۔ان کی ضیافت میں شریک ہوتی ہے پرانے زمانے کے شمن اور کاہن اور آج کے روحانیت پسند (Spiritualists) روح کی حاضری کا دعوٰی بھی کرتے ہیں اور اہل مذہب وتصوف کی روحانیت بھی اسی عقیدت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

متکلمین نے روح کے بارے میں عجیب وغریب موشگافیاں کی ہیں۔صوفیوں اور سریت پسندوں کا مشہور عقیدہ ہے کہ ابتدائے آفرینش میں انفرادی روح، روح کل کا جز تھی جو اس عالم مادی میں آکر اپنی اصل سے جدا ہوگئی یہاں وہ اپنے ماخذ میں واپسی کے لیے بے قرار رہتی ہے اور اس کے فراق میں تڑپتی ہے۔ چنانچہ ان کے خیال میں انسانی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی روح کو ریاضت تجرد مراقبے اور تپ سے کام لے کر مادے کی بندشوں سے رہائی دلوائے تا کہ وہ دوبارہ روح کل میں جذب ہونے کے قابل ہوجائے۔یہی جذب وفنا روح کی بقاء ہوگی اور اسی مقصد کے لیے صوفیہ، جوگی، ویدانت اور سریت پسند دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے جپ تپ کرتے ہیں۔امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''مشکواۃ الانوار'' میں روح کی چار قسمیں گنوائی ہیں۔جدید نفسیات کی رو سے روح کو انسانی ذہن سے خارج میں کوئی مستقل بذات ہستی تسلیم نہیں کیا جاتا۔امام غزالیؒ کے بقول روح جسم میں آنے کے بعد حادث ہوتی ہے جیسے صورت آئینے میں نظر آتی ہے اور موت آنے پر عالم ارواح کو لوٹ جاتی ہے۔امام غزالیؒ کے اس فلسفے پر سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب قانون اسلام میں شدید تنقید کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ؛

''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جب امام غزالیؒ نے روح کو مادی تسلیم نہیں کیا بلکہ بغیر جسم کے مانا ہے اور کہا کہ نہ وہ جسم میں داخل ہے نہ جسم سے خارج نہ اس سے ملی ہوئی ہے نہ جدا ہے بلکہ اس کا تعلق بدن سے ایسا ہے جیسے صورت کا آئینے سے تو وہ انسان کے افعال سے اخلاق حسنہ یا اخلاق قبیح کیونکر حاصل کرتی ہے''۔(۱۶)

☆☆☆☆☆☆

روح کو مادی سمجھنا آسان ہے مگر یہ سمجھنا سخت مشکل ہے کہ وہ غیر مادی ہو کر مادے کو کس طرح متحرک کرتی ہے اس امر میں مادیت پسندوں کا استدلال یہ ہے کہ جس شے کو روح کہا جاتا ہے وہ انسانی ذہن سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی اور ذہن مغز سر کا فعل ہے۔ مغز سر ایک مادی چیز ہے لہٰذا روح بھی مادہ ہوئی۔ جب موت پہ مغز سر کا فعل ختم ہو جاتا ہے تو روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پہ مادیت پسند روح کے انفرادی وجود کے منکر ہیں۔ مسلمانوں میں فرقہ کرامیہ اور حنابلہ روح کو جسم مانتے ہیں اور حشر اجساد کے قائل ہیں یعنی ان کے خیال میں قیامت کے دن انسان اسی جسم اور روح کے ساتھ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا جس کے ساتھ وہ اس دنیا میں زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ شیخ ابن العربی نے روح اور نفس میں فرق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روح انسان میں عقلی اصول ہے جس سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ جب کہ نفس حیاتِ حیوانی ہے۔ لغتِ تاج العروس میں نفس سے مراد ذہن اور روح سے مراد زندگی لیا گیا ہے۔ روح کے وجود سے نسخِ ارواح یا آواگون کا قدیم عقیدہ بھی وابستہ ہے۔ یہ عقیدہ قدیم مصر میں بھی تھا لیکن ہندوؤں نے اس پہ بڑی شرح وبسط سے بحثیں کی ہیں۔

ہندوؤں کے خیال میں آتما (انفرادی روح) ایشور (خدا) اور پراکرتی (مادہ) تینوں ازلی وابدی ہیں اور غیر مخلوق ہیں۔ ایک اور مغربی مفکر (Monier Willams) نے ہندوؤں کے قدیم عقائد پہ بحث کرتے ہو لکھا ہے کہ نسخ ارواح کا تصور غیر آریائی ہے اور دراوڑوں سے یادگار ہے۔ رگِ وید میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا اس میں روح کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وہ موت کے بعد پانیوں میں چلی جاتی ہے۔ ہندوؤں نے دراوڑوں کے تصور پر کرم کا پیوند لگایا اور کہا کہ انسان کی روح اپنے نیک

اعمال کی جزا میں اور بد اعمال کی پاداش میں موت کے بعد نیا چولا بدلتی ہے اصطلاح میں اسے سنسار چکر یا آوا گون (آنا جانا) کہا جاتا ہے۔ جب تک روح کو نجات یا مکتی حاصل نہ ہو وہ جنم روپ اختیار کرتی رہتی ہے اور اسے چوراسی لاکھ جنموں سے گزرنا پڑتا ہے۔ گوتم بدھ اور جین روح کے منکر رہے ہیں اسی لیے انھیں ناستک یا ملحد کہا جاتا ہے۔ بدھ مت کا بڑا اعتقادی تضاد یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ روح نامی کسی وجود کا سرے سے منکر ہے دوسری طرف وہ تناسخ ارواح کا بھی قائل ہے۔ اگرچہ بدھ مت جین مت اور سکھ مت میں ہندوؤں کے مہمات عقائد کی پیروی کو مسترد کر دیا گیا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ حیات بعد موت اور آوا گون کے بھی قائل ہیں۔ آوا گون ظاہراً نہایت رجعت پسند عقیدہ ہے جس کی آڑ لے کر مکار برہمنوں نے نیچ ذات والوں کو یقین دلا رکھا ہے کہ ان کے سابقہ جنموں کے گناہوں کی پاداش میں انھیں نیچ پیدا کیا گیا ہے چنانچہ وہ بغیر کسی حیل وحجت کے ایشور کی مرضی کے سامنے سر جھکائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں جب تک آوا گون کا یہ عقیدہ زندہ ہے وہاں کے کروڑوں نیچ ذات والوں کو ان کا اصل انسانی مقام میسر نہیں آ سکتا۔ مسلمانوں میں اسماعیلی خوجے بھی آوا گون کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں منکر نکیر مردے سے پہلا سوال یہی کرے گا کہ کیا تم اپنے امام کو پہچانتے ہو اگر جواب نفی ہو تو مردے کو روح کا قالب بدلنا پڑتا ہے اور جب تک وہ اپنے امام کی شناخت نہیں کر لیتا اسے سنسار چکر سے نجات نہیں مل سکتی۔ اخوان الصفا بھی نسخ ارواح کے قائل تھے وہ کہتے تھے کہ روح نباتات، جمادات اور حیوانات میں سے گذرتی ہوئی انسان تک آتی ہے اور پھر عالم علوی کو پرواز کر جاتی ہے۔ دنیا کا ہر مذہبی عقیدہ کامل سپردگی کا تقاضا کرتا ہے اور اس میں چوں چراں کی گنجائش نہیں ہوتی اسی بنا پر (Carel Zang) مذہبی عقیدے کو عشق سے مماثل قرار دیتا ہے اس کے خیال میں:

"عشق اور مذہبی عقیدے میں ایک سے زیادہ عناصر مشترک ہیں اور دونوں میں کامل سپردگی ضروری ہے۔ صرف وہی اہل مذہب جو اپنے خدا کے سامنے پوری طرح سر تسلیم خم کرتے ہیں اس کی بارگاہ میں مقبول ٹھہرتے ہیں اور اس کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں اسی طرح عشق کے حیرت انگیز اسرار بھی اسی شخص پہ کھلتے ہیں جو اپنی محبوبہ کے سامنے کامل سپردگی سے کام لیتا ہے"۔

☆☆☆☆☆☆

مذہبی عقیدے اور تقدس کے احساس کا بھی آپس میں گہرا تعلق ہے۔مشہور مغربی دانشور (Jon Hukslay) نے تقدس کے احساس کو مذہب کا جوہر قرار دیا ہے اس نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب (Religion without Revelation) میں اس امر سے تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ؛

''جو شخص کسی وجود یا شے پہ عقیدہ رکھتا ہے وہ اس کے لیے مقدس بن جاتا ہے چنانچہ اہل مذہب خداوند سے لے کر پتھروں، چٹانوں، دریاؤں پہاڑوں کی چوٹیوں، چشموں، جھیلوں، پتھر اور لکڑی سے تراشی ہوئی مورتیوں، درختوں، پھولوں، پرندوں، حیوانوں اور قبروں کو مذہبی عقیدے کی بنا پر ہی مقدس جان کر ان کی پوجا کرتے چلے آئے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے چلے آئے ہیں۔تقدس کا احساس محبت اور خوف کے ملے جلے جذبات پر مشتمل ہے یعنی انسان جس وجود یا شے کو مقدس سمجھ لیتا ہے اس سے ڈرتا بھی ہے اور اس کی جانب کشش بھی محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت مقدس اشیاء یعنی ٹیبو اور ٹوٹم کے تصور میں بھی پائی جاتی ہے۔اسی حوالے سے مانا کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔مانا یا غیر معمولی طلسماتی قوت اشیاء اور اشخاص سے وابستہ ہوتے ہیں تو مقدس بن جاتے ہیں اسی بنا پر انسان بجلی کی کڑک اور چمک، آتش فشاں پہاڑ، گھنے جنگل، گہرے غاروں اور عجیب وضع کے پتھروں کو بھی مقدس سمجھتا رہا ہے اور انھیں عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے''۔

☆☆☆☆☆☆

عقیدے کے بعد جذبہ مذہبیت پہ بحث ہوگی۔(Fried) نے کہا کہ جذبہ مذہبیت سراسر منفی جذبہ ہے اور اس کی بنا محبت پر نہیں بلکہ خوف پر رکھی ہوئی ہے۔اس سے کسی محبوب ہستی کے ساتھ قلبی تعلق و ربط پیدا

کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی مافوق الطبع ہستی کی تالیفِ قلب مطلوب ہوتی ہے۔ اگرچہ فرائڈ سے بہت پہلے لکریشس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ مذہب دہشت کی پیداوار ہے اور غاروں کا انسان اپنے آپ کو چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتا تھا۔ وہ صدیوں تک گونا گوں اندیشوں میں مبتلا رہا اور مظاہرِ فطرت سے خوف کھاتا رہا اندھیرے کا خوف، مرے ہوئے دشمنوں کے بھوتوں کا خوف، قحط اور بھوک کا خوف، موت کا خوف، امراض کا خوف، درندوں کا خوف، سانپوں کا خوف، چوروں اور لٹیروں کا خوف، سیلاب کا خوف، بجلی کی کڑک کا خوف اس کے اعصاب پر مسلط رہا جو اس کے دن کے آرام اور رات کی نیند کو حرام کرتا رہا۔ علم کی ترقی کے باوجود انسان آج بھی نامعلوم خوف کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا۔ لکریشس کی طرح "ہابس، ہولباخ، کندور اور فرائیڈ" نے بھی جذبہ خوف کے حوالے سے ہی مذہب کی توجیہ کی ہے۔ جب کہ کارل مارکس نے مذہب کو انسان کے لیے افیون قرار دیا ہے۔ کیونکہ مذہب عوام کو اگلے جہان کی نعمتوں کی بشارت دے کر انھیں دنیا میں اپنے جائز حقوق کے لیے جدوجہد کرنے سے روکتا ہے۔ بعض اہلِ تحقیق نے احساسِ جرم کو جذبہ مذہبیت کا لازمہ قرار دیا ہے اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اسرائیلی مذہب کا تعلق ہے اس میں احساسِ جرم اور جذبہ مذہبیت لازم و ملزوم رہے ہیں۔ مذہبی احساسِ جرم یہودیت سے شروع ہوا اور عیسائیوں میں سرائیت کر گیا۔ یہودیوں کا خدا یہواہ ایک قبائلی معبود تھا جس کے ہر حکم کو بجا لانا وہ اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ یہواہ کے احکام ان کی روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ محیط تھے اس لیے قدرتاً انھیں ان کی تعمیل میں دقت محسوس ہوتی تھی اور وہ لغزشوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے تھے جس کے باعث ان کے دلوں میں احساس جرم گھر کر لیتا تھا اور وہ ان خطاؤں کی قربانیاں دے کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے تھے شروع شروع میں ان کے ہاں شیطان کا تصور موجود نہیں تھا۔

شیطان کو بابل کے ایام اسیری میں یہودیوں نے اپنے مذہبی عقائد میں شامل کیا اس لیے وہ ہر برے کام کا ذمہ دار شیطان کو نہیں بلکہ اپنی فطرتِ بد کو ٹھہراتے تھے۔ آبائے کلیسا پال ولی آگسٹائن اور کلیمنٹ نے کہا کہ جب آدم نے حکم خداوندی سے سرتابی کی تو اس نے سنگین جرم کا ارتکاب کیا اور یہ گناہ اولادِ آدم کو ورثے میں ملتا ہے لہٰذا سب انسان بالطبع گنہگار ہیں اور نیکی سے گریزاں ہیں۔ ان کے مطابق جناب مسیح ؑ ہی ان کی شفاعت کر سکتے ہیں اور انھیں عذاب سے نجات دلا سکتے ہیں۔ ازلی اور موروثی گناہ سے بحث

کرتے ہوئے ولی امبروسی نے کہا کہ آدم وہوا کی جنسی مواصلت ہی ان کا اصل گناہ تھا جس سے بچنے کے لیے تجرد کی زندگی گزارنا ہے۔ اس عقیدے کے باعث جنسی مواصلت سے گناہ کا احساس وابستہ ہو گیا جو جنسی آزادی کے باوجود آج بھی عیسائی دنیا کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنا ہوا ہے۔ تاہم عیسائی سریت پسندوں کے ہاں گناہ اور ثواب کا فلسفہ قدرے مختلف ہے ان کے مطابق انسان کے لیے گناہ کرنا اس لیے ضروری ہے کہ بخشش تبھی ہو گی جب گناہ کیے ہوئے ہوں گے اور خدا کی رحمت بھی صرف گنہگاروں ہی کے لیے زور مارتی ہے اور گنہگار خدا کے محبوب ہوتے ہیں۔ ایک اور مغربی مفکر(Helan Waker) نے مذہب کی توجیہ اس طرح کی کہ حیاتیاتی پہلو سے مذہب بے چارگی اور بے بسی کے طویل طفلی دور کی پیداوار ہے۔ جس کی مثال یہ ہے کہ ایک ننھا بچہ قدم قدم پر اپنے ماں باپ کا سہارا لیتا ہے مگر جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو بے مہر دنیا کے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے اس پہ بچپن کی ناتوانی کا احساس اور تنہائی کا خوف از سر نو اس کے قلب وذہن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ جس کا مداوا وہ مذہب میں تلاش کرتا ہے اس لیے جب تک بچے کو ایک مساعد سماج فراہم کر کے اس کے ذہن سے ناتوانی کے احساسات دور کر کے اسے اس نامعلوم خوف سے نجات نہیں دلائی جاتی اس وقت تک انسان مذہب کا محتاج ہی رہے گا۔ یاد رہے کہ مذہب کے بارے میں یہ تمام نظریات اسلام کی روشنی سے قبل کے ہیں اور ان لوگوں کے قلم سے نکلے ہیں جو خود کو شامل تو اہل دانش میں کرتے ہیں مگر ان کی تعلیمات اور عملی روش سے کسی دانش کا اظہار نہیں ہوتا۔ ورنہ زمانہ ما قبل میں بھی لوگ محض عقل کے سہارے خالق تک پہنچنے میں کامیاب رہے ہیں۔

انھوں نے مذہب کے دو پہلوؤں کو نمایاں طور پہ اجاگر کیا ہے ایک اس کا موضوعی پہلو ہے۔ جس میں انسان اپنے معبودوں سے جذباتی تعلق استوار کرتا ہے اور مذہب کے دوسرے پہلو کو انھوں نے معروضی کہا جس میں رسوم وعبادات شامل ہیں۔ جس کے تحت تجرد، ریاضت، قربانی دستورِ عمل اور علم کلام شامل ہیں۔ جیسا کہ ارواح کے باب میں ذکر آ چکا ہے کہ روح کا تصور بھوت ہمزاد یا ایک چلتی پھرتی لطیف کایا میں بدل گیا تو انسانوں نے اپنے آباء کی ارواح کی پوجا شروع کی۔ یہی پوجا بعد میں منظّم ہو کر دیو مالا اور مذہب کی صورت اختیار کر گئی۔ مذہب نے ارواح کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی سعید ارواح اور بد ارواح اسی نسبت سے ان کے دیوتا بھی سعید اور شقی دیوتاؤں میں تقسیم ہو گئے۔ تاہم اس دور میں انسان مجبور تھا کہ سعید اور شقی ہر دو قسم کے دیوتاؤں کی پوجا کرے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قربانی کرے۔

اس لیے کہ سعید دیوتا کی پوجا تو اظہارِ تشکر کے لیے کی جاتی مگر شقی دیوتا کی پوجا اس لیے کی جاتی ہے تا کہ لوگ اس کے آزار سے محفوظ رہ سکیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی ہندوؤں کے ہاں جو دیوی یا دیوتا جتنا زیادہ بدصورت ہوگا اس کی پرستش اتنے ہی ذوق وشوق سے کی جائے گی۔ کالی دیوی گنیش اور جگن ناتھ اس کی معروف مثالیں ہیں۔ انسان نے دیوتا کو انسانی طبع پہ قیاس کیا ہے اس لیے جن باتوں سے انسان خوش ہو سکتا ہے اسی کی تمثیل وہ دیوتاؤں کے لیے لائے ہیں۔ چنانچہ انسانوں نے اپنے اسی تخیل کے پیش نظر اپنے دیوتاؤں کے بڑے بڑے معبد تعمیر کیے تا کہ ان کے دیوتا وہاں آرام وسکون کے ساتھ رہ سکیں۔ ہندو اپنے مندروں کی دیواروں کو اس لیے جاذبِ نظر بناتے ہیں تا کہ ان کے دیوتا کے حسِ جمال کی تسکین ہو سکے وہ دیواروں کو خوبصورت کاشی گری اور دلآویز مجسّموں سے سجاتے ہیں۔ وہ اپنے دیوتاؤں کے بت سونے اور چاندی سے ڈھالتے ہیں انھیں اطلس وکمخواب کے قیمتی لباس پہناتے ہیں پھر انھیں قیمتی پتھروں ہیرے جواہرات یاقوت ولعل زمرد نیلم اور پکھراج وغیرہ سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے معبودوں کے لیے شمعیں جلانے کا اہتمام بھی کرتے وہ پتھر کے بتوں کے سامنے لذیذ کھانے چن کے بیٹھ رہتے اور ہندوؤں کے ہاں تو آج تک دودھ اور اس سے بنی ہوئی اشیا مکھن بالائی وغیرہ خود کھانے کی بجائے اپنے ٹھاکروں کو بھینٹ کی جاتی ہے۔

ان کے مندروں میں پوجا کے وقت فضاؤں کو معطر رکھنے کے لیے طرح طرح کی خوشبویات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کے ذوقِ حسن کی تسکین کے لیے سینکڑوں پری چہرہ دیوداسیاں ان کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہتی ہیں اور دن میں تین مرتبہ ناچ گا کر اپنے دیوتاؤں کا جی بہلاتی ہیں۔ ان کے ہاں مقدس بکرے اور بیل کی زوجیت میں خوبصورت لڑکیاں دی جاتی ہیں۔ دیوتاؤں کی ستائش کے لیے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے طائفے پرے باندھ کر اور سریلی آوازیں ملا کر سازوں کی گت کے ساتھ دلکش انداز میں بھجن اور گیت گاتے ہیں جس میں ٹھاکروں سے پرجوش عقیدت اور محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کے سوانح پر مبنی ناٹک بھی کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھ کر چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ جملہ فنون لطیفہ فن تعمیر فن سنگ تراشی مصوری شاعری موسیقی اور ناٹک مذہب ہی کے دامن میں پروان چڑھے تھے۔ مالیاتی پہلو سے یہ بات اہم ہے کہ ملک کی آمدنی اور محصولات کا کثیر حصہ مندروں اور پروہتوں پر ہی خرچ کیا جاتا۔ چین کے قبضے سے پہلے تبت کی آمدنی کا ایک تہائی حصہ اس مکھن پہ خرچ کیا

جاتا جس سے معبدوں کے چراغ روشن کیے جاتے تھے۔ پوجا کی رسوم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آدمی اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے اس کی بڑائی کرے اور اس کے سامنے اپنی عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرتا رہے۔ اس کی سب سے معروف صورت رکوع ہے جو صابئین کے ہاں بھی مروّج تھی۔ رکوع و سجود سے بندے کی مسکنت اور معبود کی عظمت وجلالت کا اظہار ہوتا ہے اس کی انتہائی صورت ہندوؤں کے ہاں پائی جاتی ہے جہاں لوگ پیٹ کے بل لیٹ کر اپنے تیرتھ کی طرف جاتے ہیں۔ اکثر اقوام میں طواف بھی پوجا کا لازمہ رہا ہے۔ اس کا آغاز بھی صائبین سے ہوا جن کا تصور یہ تھا کہ جس طرح سات ستارے خداوند خدا کا طواف کرتے ہیں اسی طرح بندوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ مقدس معبودوں اور دیوتاؤں کے مجسّموں کا طواف کریں۔ ہندوؤں کے ہاں طواف کو پرکرما کہا جاتا ہے۔ اسلام سے قبل عرب کے مرد اور عورتیں مادر زاد برہنہ ہو کر کعبے کا طواف کیا کرتے تھے اسی طرح قربانی بھی ایک ہمہ گیر مذہبی رسم ہے جو ابتدائی زمانے سے انسان کے اندر موجود تھی (Robert Smith) نے قربانی پر ایک سیر حاصل بحث کی جو اس کی کتاب (Religion of the semites) سے پیش کی جاتی ہے جہاں وہ لکھتا ہے کہ؛

> قربانی کی ہمہ گیری کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کوئی بھی مذہب خواہ وہ الہامی ہو یا سامی قربانی کے تصور کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس لیے کہ قربانی انسان کا بہت قدیم عمل ہے جو ہزراوں سال سے جاری ہے۔ قربانی کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہے کہ یہ وہ مذہبی عمل ہے جس کی بنا پہ ذبیحہ یا بھینٹ کرنے والے کی مراد پوری ہوتی ہے یا اس مذکورہ شخص کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔ قربانی وہ تحفہ یا نذرانہ تھا جو اول اول انسان ان فوق الطبع ہستیوں کو پیش کیا کرتا جن کی خوشنودی یا رضا کا وہ طالب تھا تاہم گذرتے وقت کے ساتھ دیوتاؤں کا تصور پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا اور انسان کے معبود اس سے دور ہوتے چلے گئے تو ان تک اپنی قربانی یا نذرانہ پہنچانے کے لیے رسوم وشعائر وضع کیے گئے۔ انسان کا اگلا قدم یہ تھا کہ اس نے عمومی نذرانوں کی بجائے اب ترکِ دنیا اور ترکِ لذات کر کے اپنی ذات کا نذرانہ دینا شروع کیا۔ ذات کی قربانی کا تصور صائبین سے شروع ہوا اور دنیا کے بہت سے معاشروں اور مذاہب میں جگہ بنانے میں کامیاب رہا۔ بدھ مت میں اسے عروج حاصل ہوا کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی

ترکِ دنیا پر رکھی تھی۔ تاہم ہندوازم، جین مت، سکھ ازم عیسایت اور اسلام بھی ذات کی قربانی سے اپنے دامن کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ اپنی ذات کی قربانی کا تصور تصوف کے راستے اسلام میں داخل ہوا۔ ہر چند کے اسلام کے حقیقی شعائر میں راہبانیت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ قربانی کا رواج سامیوں میں عام تھا۔ مولک اور بعل دیوتا کے مذبحہ سال بھر خون سے تر رہتے۔ انسان کی قربانی افضل تصور کی جاتی اور اسے آفات و بلیات کے دفعیے کے لیے موثر تصور کیا جاتا۔ ایک اور تصور بھی قربانی کے پس منظر میں بیان کیا جاتا ہے جو یہ ہے کہ صبح تاریخ سے خون اور اس کے حوالے سے سرخ رنگ حیات اور شباب کی علامت رہی ہے۔ قدماء اپنے دیوتاؤں کے حضور قربانی اس لیے کیا کرتے تھے کہ سرخ خون کے باعث ان کی زندگی طویل ہو اور ان کی توانائی بحال رہے۔ دنیا کے بہت سے معاشروں میں اس طرح کے قدیمی تصورات موجود تھے۔ مثلاً میکسیکو کے باشندے سورج دیوتا پر انسان قربان کیا کرتے تھے اس لیے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر یہ قربانی نہ کی گئی تو سورج کی شعاعیں مانند پڑ جائیں گی اور وہ بجھ کے رہ جائے گا۔ یہودیوں کے ہاں بڑے بیٹے کی قربانی کی قدیم رسم بابلیوں کے واسطے سے داخل ہوئی جو اہل عرب تک پھیل گئی تھی جس کی معروف مثال جناب عبدالمطلب کے بیٹے حضرت عبداللہ کی ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوئے تو وہ ایک بیٹے کی قربانی دیں گے۔ چنانچہ اللہ نے انھیں دس بیٹوں سے نوازا اور جناب عبدالمطلب نے حضرت عبداللہ کی قربانی کا ارادہ کیا مگر اہل مکہ کی مداخلت سے اس امر کا فیصلہ ایک کاہنہ پر چھوڑ دیا گیا جس کے کہنے پر حضرت عبداللہ کے بدلے سو اونٹ قربان کیے گئے۔ یہودی اپنے کھیتوں کے پہلے خوشے اور اپنے پیڑوں کا پہلا پھل بھی یہواہ پر قربان کیا کرتے۔ وہ خطا کی قربانی بھی کیا کرتے تاکہ یہواہ ان کی غلطیاں اور لغزشیں معاف کر دے۔ ان کے ہاں سوختنی قربانی کا رواج بھی موجود تھا جس کا طریقہ یہ تھا کہ کسی مقدس چٹان یا پتھر پر آگ جلا کر اس میں ذبیحہ کی انتڑیاں وغیرہ رکھ دیتے تاہم ذبیحہ کے گوشت کے عمدہ حصے پروہتوں یا ربائیوں کو دیئے جاتے۔ عہد نامہ قدیم میں آیا ہے کہ یہواہ کو یہ قربانی بہت مرغوب تھی اور وہ اس کی خوشبو سونگھ کر خوش ہوتا تھا۔ عام طور سے آج تک قربانی کے جانور کو مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے

ہاں سر کے بال منڈوا کر بھی دیوتا کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے اور ہندو عورتیں آج بھی گیا کے مندر میں اپنے سر کے بال کٹوا کر ٹھاکر کو بھینٹ دیتی ہیں یا بعض اوقات کسی دیوتا کے لیے سر کے بالوں کی ایک لٹ بھی بڑھا دی جاتی ہے تاکہ وہ اس کے ہاں قربان کی جا سکے۔ میں نے خود اس امر کا مشاہدہ پنجاب اور سندھ کی دیہاتی زندگی میں کیا ہے کہ وہ لوگ جو خود کو مسلمان کہتے ہیں کسی دربار یا کسی پیر کے مزار پر چڑھانے کے لیے اپنے بچوں کی لٹ بڑھا دیتے ہیں اور پھر وقت آنے پر قربان کر دیتے ہیں۔ سب سے خوفناک قربانی ایران میں کی جاتی تھی جس کا تصور کر کے ہی دل دہل جاتا ہے۔ یہ ہولناک قربانی مولک دیوتا کے حضور کی جاتی جس کا طریقہ یوں تھا کہ مولک دیوتا کے عظیم اور قوی الجسّہ بت کے شکم میں آگ کا آلاؤ روشن کیا جاتا پھر مولک دیوتا کے بڑھے ہوئے ہاتھوں پہ جن پر تیل لگا ہوتا کسی نومولد بچے کو رکھ دیا جاتا بچہ حرکت کرتا اور پھیلے ہوئے ہاتھوں سے تیل کی پھسلن کی وجہ سے آگ کے آلاؤ میں جا گرتا اور زندہ ہی جل جاتا۔ بچے مولک دیوتا کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے پھسل پھسل کر مولک کے شکم میں بڑھکتے شعلوں کی خوراک بنتے رہتے۔ ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی قربانی سے بلائیں ٹل جاتی ہیں سب سے افسوس ناک امر یہ تھا کہ کبھی کبھی مولک دیوتا کے لیے اجتماعی قربانی بھی کی جاتی مورخین بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جب رومیوں نے کارتھیج شہر کا محاصرہ کیا تو محاصرہ طول پکڑ گیا اور شہر میں خوراک کی قلت پیدا ہونے لگی جس پہ مذہبی حلقوں نے اجتماعی قربانی کا واویلہ بلند کیا۔ چنانچہ ایک ہی دن میں صبح سے لے کر شام تک دو سو معصوم اور ننھے بچے مولک دیوتا کے ہاتھ سے پھسل کر اس کے آگ بھرے شکم کی خوراک بن گئے۔ مگر رومیوں نے محاصرہ پھر بھی نہ اٹھایا۔ ہندوستان میں قربانی آریاؤں کے واسطے سے داخل ہوئی ہندو آریاؤں میں قربانی کی تین بڑی رسمیں تھیں نرمیدہ یگ (انسانی قربانی) اشومیدھ یگ (گھوڑے کی قربانی) اور گئیو میدھ یگ (گائے کی قربانی) وہ گھوڑے کو دیوتا پہ قربان کرنے سے پہلے ایک بکری ذبحہ کرتے تاکہ وہ جا کے دیوتا کو بتائے کہ اس کے لیے سفید گھوڑے کی قربانی تیار ہے۔ وہ سفید گھوڑے کا سینہ چاک کر کے اس کا دھڑکتا ہوا دل کھینچ کر باہر نکال لیتے اور گھوڑے کو تبرکاً کھا جاتے۔ ان کی کتابوں میں گائے کی قربانی کا ذکر بھی موجود ہے۔ اگرچہ آج ہندو گائے کو

بھی دیوی قرار دے بیٹھے ہیں وہی ہندو پہلے گائے کو قربان کر کے شوق کے ساتھ اس کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ انسان کی تاریخ میں یہ قربانیاں فی الحقیقت قدیم انسانوں کی اجتماعی ضیافت سے یادگار تھیں جن میں مقدس ٹوٹم یا کسی دوسرے جانور کا گوشت سارا قبیلہ مل بیٹھ کر کھاتا تھا تاکہ اس کی پراسرار طلسماتی توانائی ان میں حلول کر جائے۔ ہندوستان میں صدیوں تک کالی دیوی کے مندر میں انسان کی قربانی کا رواج تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد تک جاری تھا۔ پھر انگریزوں نے اسے وحشت قرار دے کر اس پہ پابندی عائد کر دی۔ آج بھی کالی گھاٹ کلکتہ میں کالی ماں کے مندر پہ بکریوں کی قربانی دی جاتی ہے اور اولاد کی خواہش مند عورتیں ان کا بہتا ہوا لہو چاٹتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں کانگڑی کے قریب ایک مندر ہے جہاں لوگ اپنی زبانیں کاٹ کر دیوی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ دیوی کی برکت سے کٹی ہوئی زبانیں اسی وقت اپنی اصل حالت میں واپس آجاتی ہیں"۔

مذہبی اخلاق یا دستور عمل

اگر چہ اپنے ابتدائی دور سے ہی انسان نے اپنے لیے اخلاق کی بنیادوں کو استوار کرنا شروع کر دیا تھا تاہم اخلاق کی اصل بنیاد انسان کو مذہب ہی نے فراہم کی۔ جب انسان نے کھیتی باڑی سیکھی تب ان میں شخصی املاک کا تصور پیدا ہوا۔ اراضی، گائے، بیل، بھیڑ، بکری کی طرح عورتوں، غلاموں اور باندیوں کو بھی شخصی املاک میں شامل کر لیا گیا۔ قدیم ترین ضابطہ اخلاق جسے تاریخ محفوظ رکھ سکی اسے شاہ حمورابی والئی بابل نے مرتب کیا تھا یہ ضابطہ گلی الواح میں محفوظ تھا۔ شاہ حمورابی کا دستورِ اخلاق دو سو پچاس شقوں پر مشتمل تھا جنہیں شخصی املاک کے تحفظ اور قصاص کے اصول پر مرتب کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، قانونِ حمورابی میں نہایت سخت سزائیں مرتب کی گئیں تھیں ان کے ہاں قتل، زنا، اغوا، راہزنی سرقہ اور مفرور غلام یا باندی کو پناہ دینے کی سزا موت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہی املاک یا محل میں تصرف کرنے اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کی سزا بھی موت تھی اس طرح حمورابی سلاطین نے اُمرا، جاگیرداروں اور پروہتوں کی شخصی املاک کو تو تحفظ فراہم کیا مگر عوام کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

مذہبی اخلاق کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے مرتب کرتے وقت معاشرے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا اور اسے لوگوں کے سروں کے اوپر سے مسلط کر دیا جاتا ہے۔ شاہ حمورابی نے بھی شروع میں یہی دعویٰ کیا تھا کہ یہ دستورِ عمل اسے شمس دیوتا نے دیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ ہے جو شخص اس سے روگردانی کرے گا وہ عاصی اور مرتد ٹھہرے گا۔ مذہبی اخلاق کے اوامر و نواحی ازلی و ابدی ہوتے ہیں حالانکہ عملاً معاشی اور عمرانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ شکار کے زمانے میں چوری ڈاکے اور قتل کو مستحسن خیال کیا جاتا تھا اور ان امور کو شجاعت کی علامت قرار دیا جاتا تاہم زرعی انقلاب کے بعد انھیں سنگین جرائم قرار دے دیا گیا اور ان کی سزا موت مقرر کی گئی۔

اخلاقی قدروں کے اضافی ہونے کی مثال جنسی اخلاق سے ملتی ہے۔ مادری نظام معاشرہ میں عورت کی عصمت اور بکارت کو معائب میں شمار کیا جاتا تھا اور لوگ باکرہ لڑکی سے شادی کرنا پسند نہیں کرتے تھے جیسا کہ آجکل کے قبائلیوں کے مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے۔ زرعی انقلاب کے بعد جب عورت مرد کی ذاتی ملکیت بن گئی تو اس پر عصمت اور بکارت کی کڑی پابندیاں لگا دی گئیں مرد اپنی شخصی املاک اپنے ہی صلبی فرزندوں کے لیے چھوڑنا چاہتا تھا اس لیے عورت کی عصمت اور بکارت ضروری قرار دے دی گئی۔ چنانچہ حمورابی معاشرے میں جب کوئی مرد اپنی عورت کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ غیر حالت میں دیکھتا تو اس کو حق پہنچتا تھا کہ وہ دونوں کو قتل کر دے۔

مذہبی اخلاق کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے ساتھ ایک خاص قسم کی عصبیت وابستہ ہوتی ہے جس کے مطابق لوگ مذہبی عقیدے کی بنا پر اپنے ہم مذہبوں سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں اور غیر مذہب والوں کو برا کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نیک وہ ہے جو میرا مذہب رکھتا ہے خواہ وہ روزمرہ زندگی میں کتنا ہی برا ہو اور وہ شخص نیک نہیں ہوسکتا جو میرا ہم مذہب نہیں خواہ عام زندگی میں وہ کتنا ہی اچھا اور نیک ہو۔ چنانچہ اس نظریے کی بنا پر عمل کی بجائے عقیدہ حسنِ اخلاق کا معیار بن گیا اگرچہ نظری لحاظ سے مختلف مذاہب کے پیرو دانش اور انسان دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کے حق میں دلائل بھی دیتے ہیں لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ انسان شاید فطری طور پہ ہی مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو قریب نہیں آنے دیتا۔ مذہبی اخلاق کا ایک پہلو فردّیت ہے یعنی اہل مذہب ذاتی نجات کے حصول کی خاطر اجتماعی مفاد کو

پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ذاتی نجات کے حصول کے لیے بعض بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے تجرد اور زاویہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے اور اس دنیا میں عوامی بہبود کے لیے جدوجہد کرنے کے بجائے اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں غلطاں رہے جس سے معاشرے کی ترقی پرور قوتوں کو ناقابل بیان صدمات پہنچتے رہے ہیں۔قدماء کے خیال میں فرد معاشرے کے لیے ہوتا ہے نہ کہ معاشرہ فرد کے لیے۔اخلاقیات کے نقطہ نظر سے بھی انفرادی نجات کے حصول کی بجائے معاشرے کی بہبود و فلاح کی کوشش زیادہ مستحسن ہے۔اور مسلّم ہے کہ انا پرستی کی بجائے عمومی فلاح کا احساس اخلاقیات کو زیادہ محکم اساس فراہم کرتا ہے(۱۷)۔

اس کے بعد مذہب کی اخلاقی مبادیات میں علم کلام کا ذکر آتا ہے جس کا منصب یہ ہے کہ مذہب کو عقلی اساس فراہم کی جائے۔اس مقصد کے لیے متکلمین سائنس کے جدید ترین انکشافات اور مذہب میں مطابقت پیدا کر کے مذہب کی ازلی و ابدی صداقتوں کا اثبات کرتے رہتے ہیں۔علم کلام بھی ایک قدیمی علم ہے جس سے ہر دور کے علما نے مذہب اور سائنس کا تضاد دور کرنے کی سعی کی ہے۔حقیقی طور پر مذہب اور سائنس میں اس قدر بُعد نہیں ہے مگر بعض معاشروں اور بعض دانشوروں کی مذہب سے بےزاری نے اس احساس کو اجاگر کیا ہے جیسے اہل مذہب اور اہل دانش ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔

دراصل جب اہل نظر نے فطری مظاہر کو قانونِ سبب و مسبّب کی روشنی میں دیکھنا شروع کیا اور طوفان، رعد، زلزلوں، آتش فشاں، شہاب و ثاقب، سلسلہ روز و شب، غروبِ آفتاب و مہتاب اور دیگر سیارگاں کی علمی توجیہ ہوگئی تو قدیم مذہبی عقائد کی کمزوری ظاہر ہوگئی جس سے اہل مذہب خصوصاً پروہت وغیرہ اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ردِعمل کے طور پہ وہ تحقیقی علوم کی مخالفت پہ کمربستہ ہوگئے اور انھوں نے ہر علمی تحقیق کے راستے میں روڑے اٹکانا شروع کر دیئے۔پھر انھوں نے سائنس دانوں اور فلاسفہ کو ہراساں کرنے کی مہم شروع کر دی لیکن یہ تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور علم کا رستہ نہ روکا جاسکا۔آخر کار ان کو بھی ان ابدی صداقتوں کو تسلیم کرتے ہی بن پڑی بلکہ انھوں نے ایک قدم اور اٹھایا اور سائنس کے انکشافات کو اپنے مذہب ہی کی صداقت قرار دینے لگے۔انھوں نے موقف اختیار کیا کہ سائنس کے تمام انکشافات کا راز ان کی مذہبی کتابوں سے لیا گیا ہے۔اس دعویٰ کے اثبات کے لیے انھوں نے اپنی مذہبی کتابوں کے نصوص کی عجیب و غریب تاویلیں کیں اور ان کو سائنسی علوم سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن کو

شش کی۔سائنس اور مذہب میں مطابقت کی انھی کوشش کو علم کلام کہا جاتا ہے جس کے وسیلے سے یہودی (فیلو بیوبز) عیسائی (طامس اکوناس، ابیلارڈ) ہندو (رادھا کرشنن، آروندو گھوش) مسلمان (امام غزالی اور امام رازی) جیسے متکلمین نے اپنے اپنے مذاہب کی ابدی صداقتوں سے بحث کی ہے۔

خیر و شر

یہ دو لفظ نہیں بلکہ دو مہیب حقیقتیں ہیں جن تک عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ بظاہر یہ بات عجیب سی لگے گی کہ وہ عقل جس نے جانے کتنے جہانِ اسرار مسخر کیے وہ خیر و شر میں فرق کرنے سے عاری ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ عقل خیر و شر کی حقیقت سے آگاہ نہیں اس لیے کہ اگر عقل خیر و شر تک پہنچ سکتی تو انسان وحی کی ضرورت سے بے نیاز ہو جاتا۔ خیر و شر دو راستے ہیں، دو احساس ہیں، دو نظریے ہیں جن پر انسان کی دنیاوی رفعت اور آخروی نجات کی بنیاد رکھی ہے۔ خیر و شر ازل سے ہیں اور ابد تک رہنے والے ہیں۔ خیر و شر کے مابین بعض اوقات اس قدر مہین فرق ہوتا ہے کہ زیرک سے زیرک انسان بھی اُس فرق کو جان نہیں سکتا۔ اگرچہ بیشتر اوقات خیر و شہر کی پہچان کرنا ممکن ہوتی ہے جیسے کہ محبت سراسر خیر ہے تو نفرت سراسر شر ہے، اقرار خیر ہے تو انکار شر ہے، روشنی خیر ہے تو تاریکی شر، علم خیر ہے تو جہل شر۔ روحانیت خیر ہے اور مادیت شر ہے اور ایمان پورے کا پورا خیر ہے اور کفر پورے کا پورا شر ہے۔ خیر اور شر ہی کی بنیاد پر انسانوں کے مختلف تمدنی

مظاہر وجود میں آئے۔ شر کی اصل بنیاد نفس اور شیطان کی عبادت ہے اور انھیں رب کا شریک اور ہمسر بنانا ہے۔ نفس انسانی جو برائی اور شر کا ارتکاب کرتا ہے وہ شیطان کے حکم سے کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے شیطان کے شر اور وسوسے سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ دعا سکھائی جسے وہ صبح وشام پڑھا کرتے۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرَائِیْلَ وَمِیکَائِیْلَ وَاِسْرَفِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالارْضِ ، عَالِمَ وَالشَّھَادَۃِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ، اِھْدِنِیْ لِمَا اُخْتُلِفَ فِیْہِ بِاِذْنِكَ،اِنَّكَ تَھْدِیْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔

ترجمہ؛

اے اللہ! اے جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کے مالک! اے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والے! اے پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والے! اپنے بندوں کے درمیان تو ہی فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں، جس چیز میں تیرے حکم سے اختلاف ہوا مجھے اس میں ہدایت دے دے، یقیناً تو ہی جسے چاہتا ہے سیدھے راہ کی طرف رہنمائی فرما دیتا ہے"۔(۱۳)

☆☆☆☆☆☆

ایک شر واضح ہے اور ایک شر مخفی ہے۔ واضح شر اللہ کا انکار ہے جیسا کہ آج خطہ ارض پر خالق کے وجود کا انکار کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور اسی قدر یا اس سے زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو اللہ کی وجودیت کے تو قائل ہیں مگر اللہ کے احکامات سے انکاری ہیں اور وہ شر کے شکنجے میں اس قدر جکڑے ہوئے ہیں کہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی حق کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کے سامنے خیر اور شر کے راستے کھلے چھوڑ دیئے ہیں اور اُسے اختیار عطا کیا ہے کہ وہ شر کی طرف رغبت کرتا ہے یا خیر کو اپناتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ!

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِO

القرآن الحکیم (سورة البلد 90 /10)

ترجمہ؛

''اور ہم نے دونوں راستے اُس کے سامنے کھول دیئے ہیں''۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ نساء میں فرمایا کہ:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُورًاO

القرآن الحکیم (سورة النساء 4 /31)

ترجمہ؛

'' ہم نے انسان کو راستہ دکھادیا ہے یا تو وہ شکرگزار بن جائے یا کافر ہوجائے''۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ شمس فرمایا گیا کہ!

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا (7) فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (8) قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا (9) وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا O

القرآن الحکیم (سورة الشمس 91 /7-10)

ترجمہ؛

''قسم ہے اُس ذات کی جس نے انسان کو بنایا پھر اُس نے ڈال دیا اس کے دل میں خیر اور شر کا داعیہ، یقیناً وہ پہنچا مراد کو جس نے پاک کیا خود کو اللہ کی خاطر اور نامراد ہوا وہ جس نے خود کو گناہوں کے حوالے کر دیا''۔

☆☆☆☆☆☆

حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ کا کوئی بھی لمحہ خیر و شر سے خالی نہیں رہا۔انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہا۔نفس اُسے دنیا کی لذات اور شہوات کی طرف متوجہ کرتا رہا جب کہ خیر کا داعیہ ہمیشہ اُس کو ہدایت اور اطاعت کی تلقین کرتا رہا۔چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ خیر و شر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہمیشہ سے اور ہر جگہ موجود رہی ہیں اور انسانوں کی گمراہی یا راستی کا سبب بنتی رہی ہیں۔ضروری نہیں ہے کہ وہ معاشرے جہاں شر و فساد کا غلبہ ہے وہاں سے خیر کا وجود غائب ہو جائے۔وہ کم ہو جائے گا مغلوب ہو جائے گا مگر موجود رہے گا اس لیے کہ خیر انسانی خواہش ہے اُس کے اندر کی آواز ہے۔برائی میں مبتلا ہونے کے باوجود انسان جانتا ہے کہ وہ کوئی اچھا کام نہیں کر رہا اور اس کا بوجھ وہ اپنے اندر اپنی روح پہ محسوس بھی کرتا ہے اگرچہ اکثر و بیشتر وہ اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ہدایت و خیر معاشرے کی ایک جوہری کیفیت ہے اور اسی طرح جہالت، گمراہی اور شر بھی معاشرے کی ایک جوہری کیفیت ہے اور یہ دونوں کیفیات انسانوں کے عروج و زوال سے وابستہ ہیں اور انسان کے سماجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ متوازی طور پہ جاری رہتی ہیں۔

اسی بات کو دوسرے انداز میں بیان کریں تو کہا جاسکتا ہے کہ ہدایت و خیر اللہ کی معرفت کا نام ہے اور جہالت و گمراہی وہ شر ہے جو انسان کے اندر اُس وقت اپنے ڈیرے جماتی ہے جب انسان خالق کے احکامات سے انکار کرنا شروع کر دے۔چنانچہ اقتصادیات ہوں یا اجتماعیات، سیاسیات ہوں سماجیات، معاملات ہوں یا علوم و فنون تمام امور کے لحاظ سے خیر اور شر کی متعدد صورتیں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ہزاروں لاکھوں سال گذرے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر انسانوں کو بتاتے رہے کہ یہ خیر ہے اس کو اپنا لو یہ شر ہے اس بچ جاؤ۔اللہ کے رسول جب بھی زمین پر اترے کسی بھی قوم کی طرف اترے تو جامع پیغام کے ساتھ اترے، اُن کے پیغام میں کوئی کمی اور کوتاہی تلاش کرنا عبث ہے اس لیے کہ وہ براہ راست خالق سے رہنمائی لیتے رہے۔چنانچہ اللہ کا جو بھی دین اس دنیا میں اترا چاہے اُسے کوئی بھی رسول کسی بھی قوم کی طرف لے کر اترا ہو وہ مکمل ضابطہ حیات ہوتا۔دین نے عقیدہ و وجدان پہ بحث کی ہے انسانی عمل کو صراط مستقیم پہ استوار کیا ہے۔دین ہمیشہ سے اجتماعیات، اقتصادیات، معاملات، سماجیات، سیاسیات غرض زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی رہا ہے اور ہر معاملے میں انسان کی رہنمائی کی ہے۔تمام ادیان عالم کا جن کو اللہ کے رسول لے کر مختلف اوقات میں مختلف

اقوام کی طرف اترتے رہے بنیادی عقیدہ ایک ہی رہا ہے یعنی کہ توحید اور بنیادی عقیدے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔تاریخ کے تمام ادوار میں خیر اور شر شانہ بشانہ چلتے رہے، جب بھی اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کی طرف اپنا رسول اتارا تو قوم کے کچھ لوگوں نے اللہ کے رسول کی ہدایت کو قبول کیا اور اُس کے لائے ہوئے خیر سے اپنے دامن کو بھر لیا تو دوسری طرف انکار کرنے والے بھی موجود رہے انھوں نے کہا ہم اپنے آباء کے دین پر ہیں اور اس میں کسی تبدیلی کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ بدستور نظام شر سے چمٹے رہے اور ہدایت سے انکار کیا، وہ نفس کے بندے تھے اور اللہ کے رسول عام طور پہ لوگوں کو تذکیہ نفس کی طرف بلاتے ہیں اس لیے معاشرے کے اُن لوگوں نے ہدایت قبول کرنے میں جلدی کی جن کے دلوں میں خیر کی شمع روشن تھی اور لوگوں کے اُس گروہ نے انکار کیا جو پہلے ہی شیطان کی پوجا پر خود کو مطمئن کر چکے تھے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ خیر اور شر تاریخ کی راہداریوں میں اپنے مخصوص حالات کے ساتھ بندھے ہوئے اپنے ماحول کے مطابق انسان ہی کی طرح ارتقاء کی منزلیں طے کرتے رہے اسی لیے تو آج کا شر کل کے شر سے بڑھا ہوا اور قوی ہے۔ آج کے شر کے پیچھے عقل کی کارفرمائیاں ہیں اگرچہ وہ باطل ہیں اور غور کرنے پہ ہی کھل سکتی ہیں یا پھر ہدایت اللہ کی طرف سے مقدر ہو ورنہ آج کا شر اس قدر شدید ہے کہ کل کا سادہ اور سہل شر اس سے پناہ مانگتا ہے۔دیکھیں آج کے شر میں دین اور دنیا کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے اطاعت اور خواہش نفس کو الگ الگ اہمیت دے دی گئی ہے، الغرض اس جاہلیت جدیدہ نے اپنا سارا زور دین اور دنیا کی دوئی اور تفریق پہ خرچ کر دیا ہے جس سے بڑے بڑے فکری بگاڑ نے جنم لیا اور انسان اپنی موجودہ حالت پہ اُن دلائل کی رِدا اوڑھے خالق کے احکامات سے بے نیاز شر کے راستوں کا بے دریغ مسافر ہے اور موت کی اندھی وادی کو یکسر بھول چکا ہے۔آج کے شر کے مقابلے میں کل کا شر کس قدر سادہ تھا آیئے قرآن کی زبان سے سمجھیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ!

وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْباً قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُواْ اللّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَوْفُواْ

الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلاَ تَبْخَسُواْ النَّاسَ أَشْيَاءهُمْ وَلاَ تُفْسِدُواْ فِي الأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاَحِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (85) وَلاَ تَقْعُدُواْ بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجاً وَاذْكُرُواْ إِذْ كُنتُمْ قَلِيلاً فَكَثَّرَكُمْ وَانظُرُواْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 12/7)

ترجمہ:

"اور مدین والوں کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اُس نے کہا اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو کہ اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے، تمھارے پاس تمھارے رب کی صاف رہنمائی آ گئی ہے۔ لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اسی میں تمھاری بھلائی ہے، اگر تم واقعی مومن ہو (اور زندگی کے ہر راستے پر) رہزن بن کے نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے لگو، ایمان والوں کا راستہ روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمھیں بہت کر دیا اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ اس دنیا میں انکار کرنے والوں کا کیا حال ہوا ہے"۔

☆☆☆☆☆☆

غور کریں کہ کس قدر سادہ انداز میں عقیدہ، معاشیات، سیاسیات، سماجیات اور نظمِ اجتماعی کی چند لفظوں میں تطہیر کر دی گئی ہے۔ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم کے لیے پیغام ہے جس میں عقیدہ بھی ہے اور شریعت بھی، عقیدہ تو وہی قدیمی ہے جو روزِ اول سے چلا آ رہا ہے کہ اللہ ایک ہے اور اُس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں لہٰذا تم اللہ کی عبادت کرو کہ وہی اس لائق ہے کہ اُس کی عبادت کی

جائے۔عقیدے کو مختصر بیان کیا کہ اس میں کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ پیغام توحید تھا جو ایک قدیمی پیغام ہے اور لوگوں کے ایک گروہ کے دل میں ابھی تک اُس کی یاد موجود تھی۔تاہم اس کے مقابل شریعت کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے اور معاشیات کے ضمن میں فرمایا کہ اب جبکہ اللہ تعالیٰ کی صاف اور سیدھی رہنمائی تم تک پہنچ چکی ہے اس لیے پورا تولا کرو اور لوگوں کا نقصان نہ کیا کرو۔اجتماعی اور سیاسی رہنمائی کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اب جبکہ زمین پہ نظام خیر آ چکا ہے تو زمین پہ فساد پھیلانے سے باز آ جاؤ کہ فساد تو کھلا ہوا شر ہے۔پھر فرمایا کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے مت روکنا۔اور اُن کو اُن کی اپنی ہی تاریخ کی متوجہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ تم جانتے ہو اللہ کا انکار کرنے والوں کا کس قدر برا حال ہوا اور اُن کے کھنڈر آج بھی اُس تباہی اور ذلالت کو اپنی زبان حال سے بیان کر رہے ہیں جن میں انکار کرنے والی قومیں مبتلا ہوئیں۔

اس کے بعد ہم بتانا چاہتے ہیں کہ شر سے انسانوں کے مختلف گروہوں میں جو فکری بگاڑ پیدا ہوتا ہے وہ کس طرح انسانی معاشروں پر اثر انداز ہوتا ہے اور اُن کو اللہ کی راہ سے غافل کر دیتا ہے۔خیر وہ جائے عافیت ہے جس کی پناہ میں گزری ہوئی زندگی انجام کار کے لحاظ سے کامیاب قرار دی جاتی ہے جب کہ شر کے سائے میں زیست کرنے والے معاشروں کا عجیب ماجرہ ہے۔وہ اپنی بیمار روح کو طرح طرح سے بہلاتے ہیں اسے دولت کے کرشموں سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں ،ناکامی پر شراب پیتے ہیں ،زنا کرتے ہیں ،سود کھاتے ہیں اور لوگوں سے گلہ کرتے ہیں کہ اُن کی زندگی میں سکون نہیں۔

وہ خود کو اللہ کا ماننے والا بتاتے ہیں مگر عمل کے حوالے سے وہ انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔فکر و عمل کا یہ بگاڑ خیر و شر کی پہچان چھین لیتا ہے اور انسان اپنی منزل کے خدوخال تک بھول جاتا ہے۔دراصل اُسے علم وحی کی ضرورت ہے جو اُس کی سسکتی روح کو اطاعت و خیر مہیا کر سکے مگر وہ ہے کہ سائنس کی طرف رجوع کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے اور ناکامی کا الزام خود پہ لینے کے بجائے دوسروں پہ رکھتا ہے۔اکثر و بیشتر اہل مغرب کا یہ حال ہے کہ وہ عقیدے کی برائی میں ملوث ہیں ،حقیقت میں اصل عقیدہ تو وہ ہے جو انسان کو کائنات میں اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرے۔اس کی لغزشوں کو درست کرے،اس کی سمت کو درست کرے۔اس کے سلوک و وجدان میں ربط اور اس کے فکر و عمل

میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ اگر یہ ہو کہ زندگی کے ایک پہلو میں عقیدہ کارفرما ہو اور اس کے باقی پہلو عقیدے کی بالادستی سے خالی ہوں تو اس کو عقیدے کے مطابق زندگی گزارنا نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ یہ جاہلیت ہی کی ایک صورت ہوگی اور انسان شر کے راستے پر ہوگا۔ چنانچہ جس طرح ایک فرد شر کے راستے پہ چلنے کی قیمت ادا کرتا ہے اسی طرح اگر کوئی پورا معاشرہ پورا سماج شر کی راہوں پہ چل نکلے تو اُس پورے معاشرے پورے سماج کو اس شر کی قیمت ادا کرنی پڑے گی کیونکہ یہی اللہ کی سنت ہے۔ چنانچہ جب کہیں جہاں کہیں کسی بھی قوم کے عقیدے میں ذرا سا بھی انحراف پایا گیا تو وہ خیر کی راہوں سے ہٹ گیا اور شر کے راستے پہ چل نکلا تو اس سے انسانیت کا ڈھانچہ مضطرب ہو جائے گا، اس کے فکر و عمل میں ربط اور اس کے وجدان و سلوک میں ہم آہنگی ختم ہو جائے گی۔ پھر انسانیت میں نہ تو وہ وحدت پیدا ہو سکے گی اور نہ اسے امن و سکون مل سکے گا جو خیر کا منطقی نتیجہ ہے۔ بنیادی عقیدے کے انحراف سے عبادت کی لذت ختم اور افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عبادت انسان کے اُس عقیدے کی عملی تعبیر ہے کہ انسان نے زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کو حاکم مطلق تسلیم کر لیا ہے۔ اللہ کی ذات سے انحراف کے بعد انسان مضطرب متفرق اور پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ تفریق اور پراگندگی اس کے سارے فکر و عمل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے بندے کا خالق سے ہر رشتہ توڑ دیتی ہے۔ حتیٰ کے انسان کا انسان کے ساتھ اور انسان کا کائنات کے ساتھ بھی رشتہ بس واجبی سا ہی رہ جاتا ہے اور یہ سب شر کے رستوں کا منطقی انجام ہے۔ ذیل میں ہم شر کے رستوں کی کچھ نشاندہی کیے دیتے ہیں۔ ازاں بعد خیر کی منزلوں کا تذکرہ ہوگا۔ انشاءاللہ

☆☆☆☆☆☆

قید نفس ؛

عقیدہ و شریعت کے انکار کے بعد شر کی منزلوں میں سب سے اوپر نفسانی شہوتوں کا اثیر ہو کے رہ جانا ہے ۔نفسانی شہوات اگر چہ فطری جبلتیں ہیں ۔مگر اِن جبلتوں میں اعتدال کی راہ سے ہٹ جانا شہوانیت ہے ۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ :

زُیِّنَ لِلّنَاسِ حُبُّ الشَّھوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالبَنِیْنَ وَالقَنَاطِیرِ المُقنطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالفِضَّۃِ وَالخَیلِ المُسَوَّمَۃِ ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ بقرۃ 122/2)

ترجمہ؛

”لوگوں کے لیے مرغوبات نفس،عورتیں،اولادیں،سونے چاندی کے ڈھیر،چیدہ گھوڑے ،مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں مگر یہ سب تو دنیا کی چندروزہ زندگی کے سامان ہیں“۔

☆☆☆☆☆☆

اگر چہ اوپر بیان کیے گئے تمام امور انسانی زندگی کی بقا اور تسلسل کے لیے ناگزیر ہیں اور انھی عوامل کی بناپر انسان فریضہ خلافت ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے جس کو انجام دینے کے لیے اُس کو اس دنیا میں اتارا گیا۔انسانی زندگی کے لیے یہ تمام محرکات یعنی کھانا پینا،رہنا سہنا ذریعہ معاش اختیار کرنا،اور جنسی شہوت کو تسکین پہنچانا ازبس ضروری ہیں تا کہ انسانی زندگی کا وجود باقی رہے اور نظم کائنات بغیر کسی تعطل کے چلتا رہے۔تاہم انسانی زندگی سے متصل یہی محرکات اپنی معقول حد سے باہر نکل جائیں تو شہوت بن جائیں گے اور انسان حیوان بن کے رہ جائے گا۔جب انسان نفس کا بندہ بن جائے،شہوت پرستی کو مقصود و منتہا مان لے تب کس طرح ممکن ہے کہ وہ فریضہ خلافت کو احسن طریقے

پرادا کرسکے۔ بلکہ اس کے برعکس جب بنیادی ضرورتیں شہوت بن جائیں تو یہ انسانیت کے لیے تباہ کن اوراس کی طاقتوں کو پراگندہ کرنے والی بن جائیں گی۔ تب یہی انسان جو اللہ کا خلیفہ ہے تخت خلافت سے قعرِ مذلت میں جا گرتا ہے اور جانوروں بلکہ شیطان کے مقام تک پست ہوتا چلا جاتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ خلافت کا فریضہ اپنے منصب کی رفعت کے ساتھ اُسی وقت ادا کرنا ممکن ہے جب انسان خدا کی قدرت پہ یقین رکھے اُس کے رسولوں پر ایمان لائے اُس کی کتابوں کو برحق جانے اور اُس کے اتارے ہوئے قوانین کی پوری پیروی اختیار کرے۔ اس لیے کہ اللہ پر ایمان اور اس کی شریعت کے زیرِ سایہ قائم ہونے والا نظام ہی نفس انسانی کی شہوات کو محدود کر سکتے ہیں۔ انسانی زندگی کے صدیوں کے تجربات اس بات کے شاہد ہیں کہ انسان نفس کے بہکاوے سے اُسی وقت بچ سکتا ہے جب وہ اللہ کی بتائی ہوئی خیر کو اپنا لے۔ مگر اللہ کی ہدایت سے روگردانی کی صورت میں انسان بے خوف ہو جاتا ہے اور اُس کا نفس اور اُس کی عقل اُس کی رہنمائی شر ہی کی طرف کرتی ہے اس لیے کہ شر میں ظاہری لذت پوشیدہ ہے اور انسان اُس کی طرف رغبت رکھتا ہے اور یہی رغبت اُس کے لیے تباہی کا باعث بن جاتی ہے اس لیے اُس کے دل میں اِن شہوات کے حصول کی چاہت تو ہے مگر اُس نے کوئی حد مقرر نہیں کہ جس کے بعد وہ اپنی خواہش سے تائب ہو جائے بلکہ اُس کی خواہش ہے کہ اگر اُس کے پاس یہ زمین اور اس کی ساری نعمتیں بھی جمع ہو جائیں تب بھی وہ چاہے گا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس کے پاس اسی طرح کی دو زمینیں نعمتوں سے بھری ہوئی مزید ہوتیں۔

انسان اپنے معاشروں کو ظلم و بے عدلی سے بچانے یا امن وسکون کے حصول کے لیے جو قوانین بناتا ہے وہ انسان کی شہوانیت کو روکنے کے لیے کبھی بھی کافی ثابت نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ قانون اگر اُسے جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا تو وہ چھپ کے جرم کرے گا۔ معاشرہ اور سماج اگر اُسے شہوت سے باز رکھنا چاہیں گے تو وہ دوسرے راستے اختیار کرے گا اور خود کو بھی دھوکا دے گا اور معاشرے کو بھی دھوکے میں رکھے گا مگر چار و ناچار اپنی خواہش ضرور پوری کر لے گا۔ کیونکہ جب وہ جانے گا کہ وہ اپنے گناہ کو لوگوں سے چھپانے میں کامیاب رہا ہے تو وہ پھر گناہ کرے گا۔ مگر اللہ سے ڈرنے والا ایک شخص کبھی شر کی اُس راہ کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ سے

چھپ کر وہ کوئی گناہ نہیں کر سکتا اس لیے کہ اللہ تو ہر جگہ موجود ہے اور اُسے دیکھ رہا ہے۔ پہلے زمانوں اور آج کے شر میں نمایاں فرق آ چکا ہے آج بے حیائی کو فن، عہد توڑنے کو سیاست، دھوکا دینے کو عقلمندی، امارت کو کامیابی، اللہ کے احکامات کا مضحکہ اڑانے والے کو ترقی پسند اور پرلے درجے کے بے یمان کو کامیاب تاجر قرار دیا جاتا ہے۔ زمانے کی اخلاقی قدریں بدل گئی ہیں بلکہ بہک گئی ہیں۔ فطرت کی راہ سے ہٹ گئی ہیں۔ چنانچہ شر کسی عہد کا ہو، چاہے وہ ہندوستان کی جاہلیت ہو، یونانی فلاسفہ کے الجھاوے ہوں، فراعنہ مصر کا طاغوتی مزاج ہو یا بیسویں صدی کی جدید جاہلیت ہو شر و فساد کے منطقی نتائج میں یکساں ہوں گی۔

چنانچہ کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ طاغوت اپنے نظام کو بچانے اور اس کی حفاظت میں اس قدر منہمک ہوتا ہے کہ اُس کے پاس اپنی رعایا کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ فاحشات میں کس قدر ملوث ہو چکے ہیں یا اُن کی قوم میں کس قدر اخلاقی بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔ یا بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ طاغوت خود فاحشات کی اشاعت کرتا ہے تا کہ وہ خود بھی لذت حرام سے لطف اندوز ہو سکے اور لوگ بھی خواب غفلت کا شکار ہو جائیں اور حکومت کی بداعمالیاں اور مظالم شہوات کے پردے میں جاری رہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ جاہلیت اور جنسی لذتیت میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ ایک ہی شجر شر کے برگ و گل ہیں۔ چنانچہ جاہلیت اور شر میں لازم ہے کہ قوم اللہ تعالیٰ کے احکامات کی منکر ہو۔ اور یہی وہ اصل ہے جو ہر زمانے کے شر کا خاصا رہا ہے۔

یہ ساری تہذیب ایک ہی طرح کے ستونوں پہ استوار ہے اور اُن کے مزاج میں اشتراک پایا جاتا ہے چاہے وہ قدیم زمانوں کا شر ہو یا آج کے زمانوں میں ڈارون، ہیگل، مارکس اور فرائیڈ کا شر ہو۔ دیکھیں کہ ایک طرح کی جاہلیت قوم قریش میں تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا۔ کیونکہ وہ اللہ کے وجود پر ایمان رکھنے کے باوجود بتوں کی پوجا کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں اُن کو شریک جانتی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل وہ اللہ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے پیرو تھے اور عہد جاہلیت میں بھی اُن کا دعویٰ یہی تھا کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں۔ تو جب وہ عقیدے کے انحراف کا شکار ہوئے اور اللہ کے قانون کی جگہ اُس قانون نے لے لی جو انھوں نے اپنی ہوائے نفس کی بنا پر مرتب کیا تھا تب لوگوں کی خواہشات اُن کے نفس پر غالب آ گئیں۔ طاقتور

کمزور کا حق مار جاتا۔ انصاف صرف اسی کے لیے تھا جس کے پاس طاقت تھی کمزور محض سر جھکا کے رہ جاتا۔ قریش کے کاہن اور بتوں کے پجاری پرانی اور بگڑی ہوئی روایات کو زندہ کرنے والے جس بات کو چاہتے حرام قرار دے لیتے اور جس کو چاہتے حلال کر دیتے یہی نہیں بلکہ وہ ایک سال کو حلال کر دیتے اور اگلے سال کو حرام قرار دے دیتے پھر اس پہ بھی قائم نہ رہتے اور اسے حلال قرار دے لیتے ۔ باطل اور من گھڑت احکامات کے ذریعے لوگوں کو ذلیل کرتے اور وہ اپنے ہی لوگوں کی گردنوں کے مالک بن بیٹھے تھے۔ شراب جوا، عورتیں، قتل و غارت گری، رہزنی سرکشی اور تکبر الغرض ہمہ قسم کی شہوات اپنے شباب پر تھیں۔ غور کریں تو آسانی سے اندازہ ہو جائے گا کہ آج چودہ صدیاں بعد بھی جدید جاہلیت انھی بنیادوں پہ استوار ہے جن پہ قدیم زمانوں میں استوار تھی۔ آج خاص طور پہ اہل مغرب کے عقیدے اور شریعت میں اللہ کی عبادت سے انحراف اس قدر نمایاں ہے کہ اس کو بیان کرنا بھی دشوار ہے۔

زندگی کے بہت سے حقائق میں عقیدے سے انحراف اور زندگی کے سارے مظاہر میں اللہ کے احکامات سے انکار ہے۔ انکار اور انحراف اس قدر بسیط ہے کہ الحاد کی سرحدوں کو چھونے لگا ہے۔ رہ گئی شہوات کی پیروی تو وہ اس سے قبل کسی زمانے میں اس قدر نہ کی گئی ہوگی جس قدر اور جس پیمانے پر آج کی جا رہی ہے۔ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ عقائد پارہ پارہ ہیں ہر جگہ مقدسات کا مضحکہ اڑایا جا رہا ہے، انسانی تصرف کے سارے اصول اور ضابطے پرانی بات بن کے رہ گئے ہیں، وہم و گمان سے ماوراء مگر عبث باتیں ایجاد کر لی گئی ہیں حقیقت یہ ہے کہ شیطان نے شر کے رستوں کو کچھ اس انداز سے مزین کیا ہے کہ لوگ بے دریغ اُس کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ منزل کی طرف جا رہے ہیں یا کسی اندھے غار کی طرف قرآن نے سچ ہی کہا تھا کہ!

وَالْعَصْرِ O إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ O

قسم ہے زمانے کی کہ انسان خسارے میں ہے۔

☆☆☆☆☆☆

فساد فکر؛

آج کا شر فتنہ عظیم ہے اس لیے کہ اس کی تائید میں بے پناہ علم اور لامحدود مادی وسائل ہیں۔ پہلے زمانوں میں بھی لوگ برائی کرتے تھے مگر برائی کو برا ضرور سمجھتے تھے۔ آج لوگ برائی کرتے ہیں مگر اُس کے ساتھ اُن کے پاس دلیل بھی ہے۔ آج شر کی راہیں کشادہ اور آسان ہیں اور حق منہ چھپائے پھرتا ہے۔ آج کی جاہلیت نے انسانی فکر کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس میں بگاڑ اور فساد پیدا نہ کیا ہو۔ آج کی جدید مادیت نے انسان اور کائنات انسان اور خالق حتیٰ کہ انسان اور انسان کے مابین موجود تعلق کی بھی نئے سرے سے تشریح کر دی ہے۔ اور یہ بگاڑ اس قدر ہمہ گیر ہے کہ ساری کی ساری انسانی زندگی فساد کا شکار ہو کے رہ گئی ہے۔ مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ انسان اس امر پہ خوش اور مطمئن ہے۔ آج کا یورپ اور اُس کی تاریخ باہم مربوط ہیں۔ اس لیے کہ خالق کی تلاش میں اہل مغرب نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ذات الٰہی توحید سے تثلیث میں بدلی۔ پھر مذہب کا محض سایہ سا باقی رہ گیا۔ کلیسا نے لوگوں کو اس قدر اذیت دی کہ اب وہ کسی خدا کا نام سنتے ہی بدک اٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرون وسطیٰ کا مسیحی یورپ اور آج کا ملحد یورپ دونوں ہی اس شائبہ میں مبتلا رہے کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ زندگی سے مذہب کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اُن کے خیال میں عقیدہ انسانی قلب و شعور کی گہرائیوں میں کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر انسان کی عملی زندگی اس سے متاثر نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کی خود فریبی تھی شیطان کا شر تھا حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ ہی زندگی ہے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط بہر حال وہ تمام کی تمام زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور کوئی بھی شعور و عمل عقیدے کی گرفت سے باہر نہیں ہوسکتا۔ اور مذہب و زندگی، فکر و عمل اور عقیدے و شریعت کی یہ دوئی کیا انسانوں کو مذہب اور عقیدے سے دور کر سکی۔ اصل میں ایسا نہ ہوسکا کمزور ہی سہی تاہم لوگوں کی اکثریت کا اپنے خالق کے ساتھ ایک موہوم سا تعلق ضرور موجود ہے جو لاکھ پس منظر میں رہے مگر اسے پیش منظر پہ آتے دیر نہیں لگتی۔ آج کی دنیا میں لوگ اگرچہ منزل کی حقیقی شناخت کھو چکے ہیں تاہم اگر وہ خلوص دل سے منزل کی تلاش میں نکلیں تو منزل اُن سے زیادہ

دور نہیں ہے حق ہمیشہ سے اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے اور انسان کا اندر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہی حق ہے۔ انسان غور کرے تو وہ چونک اٹھتا ہے کہ یہ تو سامنے کی بات تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی۔ ہدایت کے ضمن میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُوْلِي الألْبَابِ (190) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَىَ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 3/191-190)

ترجمہ؛

"بلاشبہ آسمانوں اور زمینوں کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لیے، جن کی یہ حالت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی اور بیٹھے بھی لیٹے بھی۔ وہ آسمان اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہم کو عبث پیدا نہیں کیا اس لیے کہ تیری ذات اس سے پاک ہے کہ تو کوئی عبث کام کرے"۔

مغرب کا تصور فلاح

دنیا کی بڑی بڑی اقوام اور مذاہب پر نگاہ ڈالیں تو اہل مغرب تمام کے تمام کامیابی کے ایک تصور پر یکجا دکھائی دیتے ہیں۔اُن کو اگرچہ ایک الہامی مذہب کے پیروکار ہونے کا دعویٰ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے دین عیسوی کو گرجا گھر میں مقید کر دیا ہے۔اُن کے خیال میں مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے وہ چاہے تو اس معاملے میں سرگرم رہے چاہے تو اُسے پس پشت ڈال دے۔اول اول جب اُن کے ہاں اس تصور نے جنم لیا تو مذہب سے والہانہ وابستگی رکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور مذہب سے منہ موڑنے والوں کی تعداد کم تھی۔تاہم نفس ہمیشہ ہدایت کی پیروی میں آڑے آتا ہے اس لیے رفتہ رفتہ اہل مغرب تمام تر مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے گئے اور نفس کے بندے بن کے رہ گئے۔انھوں نے اُس آسمانی ہدایت کو چھوڑ دیا جس کے متعلق قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ:

وَفِی نُسْخَتِهَا هُدًی وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِینَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُونَ○

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 7/54)

ترجمہ:

"اور اُس تحریر (تورات) میں ہدایت اور رحمت تھی اُن کے لیے جو اپنے رب سے خوف رکھتے ہیں"۔

☆☆☆☆☆☆

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اہل مغرب کے اعمال وافعال پر تاریخی تناظر میں بھی ایک نظر ڈال لی جائے کہ انکار کی عادت صدیوں میں پختہ ہوتی ہے، مادیت اُن میں ہمیشہ سے موجود رہی تھی اسی لیے تو وہ ذرا ذرا سے فائدے کے لیے اللہ کی آیات کو بیچ دیا کرتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اللہ کے رسول اُن کو جس بات کی طرف بلا رہے ہیں وہی سچ ہے، اس کے باوجود انھوں نے اپنے نفس کی آواز پر کان دھرے اور اللہ کے احکام کا انکار کیا، اللہ کے رسولوں کا انکار کیا، اللہ کے رسولوں کو اذیت پہنچائی، اللہ کے رسولوں کا راستہ روکا، اللہ کے رسولوں کو قتل کیا، یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک مردود قوم قرار دے دیا گیا۔

قرآن حکیم میں اِن اقوام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ :

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاء فَلاَ تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلاَ تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلاً وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ○ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالأَنفَ بِالأَنفِ وَالأُذُنَ بِالأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ وَقَفَّيْنَا عَلَى آثَارِهِم بِعَيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ○ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الإِنجِيلِ بِمَا

أَنزَلَ اللّهُ فِيهِ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِناً عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ عَمَّا جَاءكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً وَلَوْ شَاء اللّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَـكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُم فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعاً فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ○ وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللّهُ إِلَيْكَ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيراً مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ○ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 5/44-50)

ترجمہ:

"ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی جو مسلم تھے اسی کے مطابق اِن یہودی بن جانے والوں کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اسی طرح ربانی اور احبار اسی پر فیصلہ کرتے تھے کیونکہ انھیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اُس پر گواہ تھے۔ پس اے گروہ یہود تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو، اور میری آیات کو ذرا ذرا سا معاوضہ لے کر بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں ہم نے یہودیوں پر حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت، اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ ہے، پھر جو قصاص کا صدقہ کرے تو وہ اس کے لیے کفارہ

ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔ پھر ہم نے اِن پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، تورات میں جو کچھ اُس کے سامنے موجود تھا وہ اُس کی تصدیق کرنے والا تھا اور ہم نے اُس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی تورات میں سے جو کچھ اُس وقت موجود تھا اُس کی تصدیق کرنے والی تھی اور خداترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے فیصلہ کریں اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔ پھر اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب (قرآن) بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے والی اور محافظ ونگہبان ہے۔ لہٰذا تم خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور حق تمھارے پاس آیا ہے اِس سے منہ موڑ کر اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی ہے۔ اگرچہ تمھارا خدا چاہتا تو وہ تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا ۔لیکن خدا نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو کہ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے پھر وہ تمھارے سامنے اصل حقیقت کو کھول دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ پس اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم اللہ کے نازل کر قانون کے مطابق اِن لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تمھیں فتنہ میں ڈال کر اِس ہدایت سے ذرا برابر بھی منحرف نہ کرنے پائیں جو خدا نے تمھاری طرف نازل کی ہے۔ پھر اگر یہ اس سے منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ نے اِن کے بعض گناہوں کی پاداش میں اُن کو مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن لوگوں میں اکثر فاسق ہیں۔ تو کیا پھر یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں اُن کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں ہے“۔

☆☆☆☆☆☆

آج دو ہزار سال ہونے کو آئے اِن اقوام کے طرزِ عمل میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔ وہ کل بھی گمراہ تھیں وہ آج بھی گمراہ ہیں، اللہ کے نازل کردہ قوانین کا انھوں نے کل بھی انکار کیا تھا اور آج بھی وہ انکار پہ ہی کاربند ہیں، وہ کل بھی نفس کی پکار پہ مطمئن تھے اور آج بھی آوازِ نفس ہی اُن کی منزل ہے، کل بھی فحاشی اور بدکاری اُن کو مرغوب تھی اور آج بھی شہوت رانی میں دنیا میں سب سے آگے وہی ہیں۔ کل بھی اُن کی آنکھوں میں حیا نہ تھی آج بھی اُن کی آنکھوں میں حیا نہیں ہے، کل بھی ذرا سے فائدے کے لیے وہ عدل سے پھر جاتی تھیں آج بھی اُن کا جھوٹ ضرب المثل ہے، کل بھی دوسروں کا حق کھا جانا اُن کا شیوہ تھا آج بھی مادیت ہی اُن کی منزل قرار پائی ہے، کل بھی وہ کتاب اللہ کے انکاری تھے آج بھی انھیں کتاب اللہ کی کوئی پرواہ نہیں، کل بھی وہ مسلمانوں سے حسد کرتے تھے آج بھی وہ مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں، کل بھی وہ اللہ کا حکم ماننے کے لیے تیار نہ تھے آج بھی وہ اللہ کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں، کل بھی وہ عقل کے اندھے تھے آج بھی وہ عقل کے اندھے ہیں، کل بھی وہ شراب کے رسیا تھے آج بھی وہ شراب کے بغیر نہیں جی سکتے، کل بھی سود اُن کی محبوب معیشت تھی آج بھی سب سے بڑے سود خور وہی ہیں، کل بھی وہ ظالم تھے آج بھی وہی ظالم ہیں، کل بھی وہ بزدل تھے آج بھی وہ بزدل ہیں، کل بھی وہ جاہل تھے آج بھی وہ جاہل ہیں، کل بھی وہ جھوٹے تھے آج بھی وہ جھوٹے ہیں اور اُن کے جھوٹ کی گواہی دیتے تاریخ کے صفحات سیاہ ہو رہے ہیں۔ یہ اگرچہ ایک طویل تذکرہ ہے کہ مغرب کا وہ معاشرہ جو آج ہمارے سامنے ہے جس نے دنیا بھر کے لوگوں کو مادیت اور الحاد کی دعوت دی ہے وہ کن راہوں سے گزرتا ہوا پستی کے اس مقام تک پہنچا۔ آج کے مغرب کی شہوت رانی، مذہب سے دوری اور دولت اکٹھی کرنے کی ہوس کن بنیادوں سے ظاہر ہوئی۔ مختصراً اُن کا جائزہ لیے بغیر شاید بات پوری طرح واضح نہ ہو سکے۔ چنانچہ مورخین نے اس طویل تر تاریخی تسلسل کو بیان کیا ہے اور الہامی کتابوں نے بھی قوم یہود و نصاریٰ کے پست روز شب کو اپنا موضوع بنایا ہے اُن کی مدد سے ہم اُس بگاڑ کو جاننے کی کوشش کریں گے جو آج ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک الہامی مذہب کے پیرو تھے ایک مذہبی کتاب کے وارث تھے اور اُن کے دعویٰ کے مطابق تو وہ آج بھی اُس کتاب پہ کاربند ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اہلِ مغرب کا اب کسی بھی کتاب سے حقیقت میں کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ محض نفس کے پجاری

ہیں اور نفس کی آواز ہی اُن کا عمل ہے اور وہ بے منزل مسافرت کے آزار میں ہیں۔ جہاں تک اُن کی کتاب کا تعلق ہے تو اِس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کتاب سے نوازا تھا اور وہ کتابِ ہدایت تھی قرآن حکیم میں اس بات کی تصدیق کی گئی ہے۔

ارشاد ہوا کہ :

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَاماً عَلَى الَّذِيَ أَحْسَنَ وَتَفْصِيلاً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُم بِلِقَاء رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الانعام 6/154)

ترجمہ؛

''ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی جو بھلائی کی روش اختیار والے انسان پر نعمت کی تکمیل کرتی اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت و رحمت تھی کہ شاید یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات پر یقین کریں''۔

☆☆☆☆☆☆

آج کا مغربی معاشرہ جن بنیادوں پر استوار ہوا ہے اُن میں کچھ موہوم سا عکس تو اُس کتاب کا ہے جو اُن پہ اتاری گئی مگر بدقسمتی سے وہ عکس بھی اُن کی عبادت گاہوں اور سرکاری بیانات تک محدود ہو کے رہ گیا۔ ورنہ حقیقت میں بھی تو مغرب کا عام شہری چاہے وہ امریکہ سے تعلق رکھتا ہو یا انگلستان سے، فرانس کا شہری ہو یا ناروے کا، آسٹریلیا کا باشندہ ہو یا ہالینڈ کا شہری ہو، جرمنی کا باشندہ ہو یا اسپین کا شہری، اٹلی کا باشندہ ہو یا سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا ہو، طرزِ زیست میں کلی مشابہت رکھتا ہے۔ خیر و شر کا تصور ایک سا ہے، کامیابی و ناکامی کا معیار ایک ہے، جنسی انارکی، معاشی تصورات، سماجی اقدار، تہذیبی افکار اور تمدنی معاملات میں تقریباً اتفاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انسانوں کا ایک انبوہ ہے جو حق و راستی سے آشنا نہیں۔ مغربی اقوام کے افکار کی بنیاد میں رومی تہذیب اور یونانی فلسفے کو بنیادی فکر و

عمل کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ یورپی محققین نے اسلام سے تعصب کی بنا پر یونانی فلسفے کو کچھ اس طور پہ اور مبالغہ کی حد تک بیان کیا ہے کہ علم وحی پر بھی اُسے فوقیت عطا کردی۔ حالانکہ خود یونانی مذہب کے لحاظ سے محض ایک تصوراتی داستان کو اپنائے ہوئے تھے اور اُن کا فلسفہ اُس الجھے ہوئے گورکھ دھندے کا نام تھا جس نے تین ہزار سال پہلے اگر انسانیت کی کوئی خدمت کی ہو تو کی ہو آج کی اس دنیا میں جب قرآن حکیم جیسی عظیم کتاب کُل عالم کو راہ نجات دکھا رہی ہے تو اُس قدیم یونانی فلسفے کو سورج کے مقابلے میں چراغ کی حیثیت بھی حاصل نہیں رہی۔ یونانی فکر و فلسفہ کا بڑا بگاڑ یہ ہے کہ اُس میں روح کو قطعی طور پہ نظر انداز کر کے عقل کو لامحدود اہمیت عطا کر دی گئی۔

غالباً اسی بنیاد پر مغرب کے دانشور نے کہا کہ یونانی فکر و فلسفہ میں انسانی رفعت اور اس کی ایجابیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ عقل کو لامحدود قرار دینے اور اسے روح پر مقدم کرنے کے نتیجے میں اُس انسانی تہذیب نے سر اٹھایا جس نے رفتہ رفتہ خالق کا بھی انکار کر دیا۔ اس لیے کہ جب ہر وجود کو ناپنے کا پیمانہ عقل ہی ٹھہری تو خالق کا وجود بھی اسی قدر قابل عمل تصور کیا گیا جہاں تک عقل کی رسائی ممکن ہو سکے۔ تاہم چونکہ اہل مغرب خود کو ایک الہامی مذہب کا پیروگر دانتے ہیں اس لیے بہرحال اللہ کے وجود کو عقل کے فریم میں نصب کرنے کی بھونڈی کوششیں جاری رہیں۔ رہ گیا اللہ کا روحانی عرفان تو اس کا وجود یونانی جاہلیت میں بہت ہی کمزور تھا۔ پھر رومی انداز فکر تھا جس نے جب عیسایت قبول کی تو بجائے اس کے کہ وہ عیسائیت قبول کرنے کی بنا پر اپنے فکر و نظر سے منحرف ہو جاتے انھوں نے عیسائیت کو اپنے اندازِ فکر کے مطابق ڈھال لیا۔ چنانچہ قرون وسطیٰ میں دین عیسوی کے اعتقادی انحطاط کے متعلق مشہور برطانوی مورخ DR, Draper اپنی کتاب "Combet in religion and Science" میں لکھتے ہیں کہ :

"منافقین کی وجہ سے عیسائیت میں شرک و بت پرستی داخل ہو گئی۔ اِن منافقین نے اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کر کے بڑے بڑے مناصب پر قبضہ جما لیا خود کانسٹائن کا بھی یہی حال تھا اس نے اپنی ساری زندگی ظلم اور گناہوں میں گزاری اور سوائے زندگی کے آخری چند دِنوں کے اُس نے کبھی بھی کنیسہ کے مذہبی احکامات کی پابندی نہیں کی"۔ (۱۸)

☆☆☆☆☆☆

دیگر تمام ادیان کی طرح مسیحیت بھی عقیدہ و شریعت پر مشتمل تھی ہر چند کہ انجیل میں احکامات کے متعلق زیادہ تفصیلات مذکور نہ تھیں بلکہ اس میں تورات کو بنیاد بنا کر بعض احکام میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی۔قرآن سے اسی بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا گیا کہ :

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰۃِ وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/156)

ترجمہ:

''انجیل تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تا کہ میں حلال کردوں اُن بعض چیزوں کو جو اس سے قبل تم پہ حرام کردی گئی تھیں''۔

☆☆☆☆☆☆

چنانچہ مسیحیت نے چند قوانین میں تبدیلی کے بعد تورات ہی کو نافذ کردیا تھا۔لیکن حقیقت میں جو کچھ ہوا اس میں مذہبی روح نام کو بھی نہ تھی ۔اس کے باوجود کہ قرون وسطٰی میں یورپ میں کلیسا کو زبردست اقتدار حاصل ہوا پھر بھی قانون الٰہی صرف شخصی احوال تک محدود ہو کر رہ گیا اور زندگی کے بڑے حصے میں رومی قانون ہی نافذ العمل رہا۔گویا لوگوں کے ذہنوں پر مذہب کا غلبہ ہونے کے باوجود قرون وسطٰی کے یورپ میں پائی جانے والی دین و دنیا کی آویزش قبیح جاہلیت کی مظہر ثابت ہوئی ۔معاشرے پر کلیسا کے اثرات نہایت گہرے اور دوررس تھے اور لوگوں کے ذہن کلیسا کی عظمت سے مرعوب تھے۔اس کے باوجود بھی زندگی کے سارے معاملات رومی قانون کے تحت ہی حل کیے جاتے تھے۔یہ ایک ارادی عمل تھا جو اہل کلیسا نے اپنایا اور اس طرزِ عمل کے نتیجے میں رومی

قانون کی توسیع اور ہمہ گیری کے لیے مواقع فراہم ہوتے رہے۔ نتیجہ کے طور پر دین و دنیا میں دوئی پیدا ہوئی۔ لوگوں کے اذہان متاثر ہوئے۔ تب لوگوں کے ذہنوں پر دین و دنیا کی دوئی اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ کاہنوں نے دنیا کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیا اور خود آسمانی بادشاہت کے وارث بن بیٹھے۔ تب یہ تصور عام تھا کہ جنت میں صرف وہی شخص جائے گا جسے کاہنوں کی خوشنودی حاصل ہو باقی سب اُس سے محروم رہیں گے۔ کلیسا کی گرفت معاشرے پر سخت تھی اس لیے کہ ریاست کی قوت اُس کی پشت پر موجود تھی۔ چنانچہ کلیسا عوام سے جو حکم چاہتا منواتا۔ کلیسا نے جہاں لوگوں کو عقلی طور پر یرغمال بنا رکھا تھا وہیں اُس نے لوگوں کا معاشی استحصال بھی کر رکھا تھا۔ وہ لوگوں سے عشر ایسے وصول کرتا جیسے کہ تاوان وصول کیا جاتا ہے۔ لوگوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ کلیسا کی زمینوں پر مفت کام کریں اور بادشاہ کے لشکروں میں بغیر کسی اجرت کے شامل ہوں اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں لوگوں پر خدا کی بجائے لوگ ہی حکمران تھے۔ اگرچہ کلیسا نے مذہب کے نام پر جاہلیت کا جو نظام وضع کیا تھا اُس نے نہ تو انسانیت کو کچھ دیا اور نہ ہی دینِ عیسوی کو لوگوں کا پسندیدہ مذہب رہنے دیا۔ رہبانیت کے لیے جو خانقائیں قائم کی گئیں وہ بدکاری کے اڈوں میں تبدیل ہو کر رہ گئیں اس لیے کہ فطرت سے بغاوت انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ قرآن حکیم نے اُن کی اس جاہلیت کی طرف جابجا اشارات نازل فرمائے گئے ہیں۔

سورۃ حدید میں ارشاد ہوا کہ!

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا .

القرآن الحکیم (سورۃ الحدید 57/27)

ترجمہ؛

''اور رہبانیت جو انھوں نے ایجاد کر لی تھی وہ ہم نے اُن پر فرض نہ کی تھی مگر اللہ کی رضا مندی کے لیے، لیکن انھوں نے اس کی پوری پوری رعایت نہ کی''۔

☆☆☆☆☆☆

دراصل تو اہل مغرب کے لیے دین مسیحیت ایک قید تھی جس سے نکلنے کے لیے وہ بیتاب تھے۔تاہم اُن کے حکمرانوں اور کلیسا نے جب اس بات کو محسوس کیا تو انھوں نے ایک نئی چال چلی۔انھوں نے پوری قوم کو مجتمع کیا اور مسلمانوں پر چڑھ دوڑے حالانکہ وہ ابھی اس قابل نہ تھے کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرتے۔چنانچہ صلیبی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جس کے آخر میں انھیں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔تاہم یہ بات اُن کے فائدے میں گئی لوگ دین مسیحیت پر ایک بار پھر مجتمع ہو گئے۔ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے معاندانہ ٹکراؤ اور اسپین میں مسلمانوں سے مصالحانہ میل جول کا نتیجہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔لیکن بجائے اس کے کہ یہ نشاۃ ثانیہ اللہ کے راستے پر چلتی جو درحقیقت اسلامی تہذیب کی بنیاد تھی اس نے نہایت تندہی سے اسلام کا مقابلہ شروع کر دیا۔اور یہ کلیسا کا ایک اور احمقانہ قدم تھا کلیسا لوگوں کو جاہل رکھنا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر لوگوں نے علم حاصل کر لیا تو وہ کلیسا کی تمام تر جاہلیت اور عیاریوں سے آگاہ ہو جائیں گے۔جیسا کہ اصول تاریخ ہے کہ آزادی پسند لوگ ظالم حکمران کے لیے ہمیشہ دردسر رہے ہیں اس لیے کلیسا اپنی ظالمانہ حکمرانی کو قائم رکھنے کے لیے شجر آزادی کو جڑ سے کاٹنے کی کوشش میں لگا رہا۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ غیر دینی (Secular) بنیادوں پر ہوئی جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ لوگ عقیدے اور دین سے دور ہٹتے گئے۔اہل یورپ نے مسلمانوں سے علم سیکھا تہذیب سیکھی اور نظریہ آزادی حاصل کیا،مسلمانوں سے تجربی علوم حاصل کیے اور انھی پر اپنی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔یورپ نے مسلمانوں سے ہی ایک قوم بننا سیکھا۔مگر جب اُن کو کچھ قوت حاصل ہو گئی تو انھوں نے اندلس کے مسلمان اہل علم کو سزائیں دینے کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کیں۔جلد ہی وہ دور آ گیا جب تحریک اصلاح مذہب کے ساتھ ساتھ صنعتی انقلاب کی صدائیں بھی سنائی دینے لگیں۔وہ نظام سرمایہ داری کے ابتدائی ایام تھے جس کی بنیادیں سود دھوکہ اور فریب پر رکھی ہوئی تھیں،محنت کش کو اُس کی محنت کا انتہائی کم معاوضہ دیا جاتا۔صنعتکار نے محنت کش پر انتہائی مظالم ڈھائے اور اُن کا خون چوسا تب کلیسا میں پراسرار خاموشی تھی۔بجائے اس کے کہ کلیسا اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا مگر دینی مصلحین تو وجدان کی اصلاح کے چکر میں الجھے ہوئے تھے۔یہ سارا تذکرہ گیارہویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک کا تھا۔پھر جب انیسویں صدی کا سورج طلوع ہوا تو اُس

کے دامن میں اہلِ مغرب کے لیے بہت کچھ تھا بلکہ وہ سب کچھ تھا جس کے وہ متمنی تھے اور جسے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے اور انیسویں صدی میں انھوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا وہ دین اور عقیدے کی قیمت پر حاصل کیا۔ اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں ہی اُس بلند و بالا اور عظیم تر صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی جا چکی تھی جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی وجہ بنی۔ چنانچہ انیسویں صدی اُن کے لیے نئی روشنی کی صدی ثابت ہوئی۔ جہاں ڈارونیت نے اُن کے افکار و نظریات کو روند ڈالا تو وہیں صنعتی انقلاب نے اہلِ مغرب سے اُن کے آبائی عقیدے کو بھی چھین لیا۔ انیسویں اور بیسوی صدی کو اگر اہلِ مغرب کی صدی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لیے کہ علم و فضل ہو یا فن و حرب، صنعت و حرفت ہو یا تجارت و معیشت ہر میدان میں مغرب کا ڈنکا ہی بج رہا تھا۔

تاہم بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں پر مغرب کی گرفت کمزور ہوئی تو مسلمان بھی میدان عمل میں نکل آیا اگرچہ وہ زیست کے متعدد میدانوں میں ابھی تک مغرب سے کوسوں پیچھے ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین کی قیمت پر اُس مادی آسائش کو حاصل کرنے پر کبھی رضا مند نہ ہوا جس کا مغرب متمنی تھا۔ مغرب نے معاشیات اور سماجیات میں جو میدان سجائے اُن میں اُسے اگرچہ کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر مادیت کی آخری منزل پر پہنچ کر جب اُس نے پیچھے دیکھا تو اُس نے جانا کہ وہ بہت کچھ کھو آیا ہے۔

نسلوں پہ نسلیں بدلتیں رہیں جس کی وجہ سے اُن کے اندر سے رفتہ رفتہ احساس زیاں بھی جاتا رہا۔ یہ سچ ہے کہ مغرب عسکریت اور معاشیات کے میدانوں میں دوسری بہت سی اقوام سے آگے نکل چکا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اُن کے ہاں انفرادی سکون مفقود ہے۔ اُن کا فرد انفرادی طور پہ ایک اضطراب کا شکار ہے اور اُس سکون کا متمنی ہے جو اسے مادیت کی انتہا پر پہنچ کے بھی نہیں مل سکا۔ صاحب دانش لوگوں نے اس امر کو جانا ہے کہ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے۔ روح کی آسائش خالق کی اطاعت میں ہے اور جسم کی آسائش مادیت میں ہے۔ تو جب انسانوں کے ایک کثیر گروہ نے روحانیت کو پس پشت ڈال کر صرف مادیت کو اپنی منزل بنا لیا تو منطقی طور پر اُن کی روح تشنہ رہ گئی اور یہ اضطراب اسی تشنگی کا مظہر ہے۔ مغرب نے خاندانی ڈھانچے کو کھو دیا، محبت اور مروّت کے رشتوں سے منہ موڑ لیا، وہ صرف نفس کا پجاری بن کے رہ گیا۔ مادیت اُس کی منزل اور شراب اُس

کی خوراک اور شہوت اُس کی لذت بن کے رہ گئی۔ سود اُس کا کاروبار اور استحصال اُس کا طرز زیست بن کے رہ گیا۔ مغرب نے انسانیت کو کئی ہزار ایٹم بم اور تیسری دنیا کا تحفہ دیا۔ دراصل تو یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ مغرب نے منزل کے تعین میں ٹھوکر کھائی انھوں نے قولاً تو خالق کے وجود کا انکار نہ کیا مگر عملاً انھوں نے خالق کے احکامات کو پس پشت ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ اپنے اہداف حاصل کرنے کے باوجود منزل سے کوسوں دور ہیں۔ روحانی خلا کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر ایک بڑے اخلاقی بگاڑ نے بھی جنم لیا جس نے نہ صرف اُن کی زندگی کو اجیرن کیا بلکہ مغرب نے دور دور تک انسانیت کا چہرہ لہولہان کر رکھا ہے۔

خاص طور پہ اُن کا ہدف مسلمان ممالک ہیں جو اُس کے تمام اہداف و مقاصد کو پورا کرتے ہیں مسلمانوں کے پاس تیل سمیت بے شمار معدنی دولت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ عسکری اور معاشی حوالوں سے قدرے کمزور مسلمان ممالک مغرب کا ہدف ہیں جن پر وہ آئے روز حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔

مغرب نے مادیت کی منزل طے کرتے ہوئے سائنس کو اپنا معبود بنالیا۔ سائنس اگرچہ ایک مفید علم ہے مگر سائنس کو خدا بنالینا اہل مغرب جیسے کم عقلوں ہی کا کام تھا۔ علم سائنس کائنات کے بارے میں معلومات کا عمدہ وسیلہ ہے مگر سائنسی کارنامے دراصل اُس عقل ہی کے مرہون منت ہیں جو خالق کی طرف سے انسان کو عطا کی گئی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ مغرب نے سائنس کو الوہیت کے مقام پر بٹھا دیا اور اسے اپنی محبتوں عقیدتوں اور اطاعتوں کا واحد مرکز بنالیا۔ اہل مغرب کی اس افسوس ناک غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے تجرباتی سائنس کے تجربہ و مشاہدہ کے محدود وسائل کے سوا علم و معلومات کے باقی وسائل سے خود کو محروم کر لیا اور جس کے منطقی نتیجے کے طور پر مغرب کا عام آدمی منزل سے مزید دور ہوتا چلا گیا یہی مغرب کا انسانیت کو تحفہ ہے۔ انسان کے سامنے ایک وسیع کائنات پھیلی ہے مگر مغرب کی تنگ نظری کی وجہ سے تمام امکانات نظری و مادی سائنس کی ناگزیر محدودیتوں کی نذر ہو گئے۔ کیونکہ در حقیقت انسان جس علم کا محتاج ہے وہ عقل سے اگلی منزل پہ حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ سائنس جو عقل کے پروں سے اڑتی ہے انسانیت کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ وہ عقل اور روح دونوں سے مدد حاصل کرتی ہے اور تب کہیں اپنے خالق کا قرب اور حقیقت نفس الامری کا واضح اور صحیح شعور حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ مگر مغرب کا طریق

مختلف تھا اُن کا تخیل ہے کہ صرف سائنس ہی وہ واحد ذریعہ علم ہے جو حیات اور کائنات کے سربستہ راز منکشف کر سکتا ہے۔ اور اس تخیل میں وہ اس قدر پختہ ہیں کہ علم وحی جیسے مقدس علم کو بھی علم سائنس کے مقابل حقیر جانتے ہیں۔ اپنی جہالت اور کم فہمی کی بنا پر اہل مغرب شاید یہ نہیں جانتے کہ علم سائنس ہنوز اپنے ابتدائی دور میں ہے اور اب بھی بے شمار ایسے مسائل موجود ہیں جن کے بارے میں انسان کی معلومات نہ صرف محدود بلکہ قابل قدر حد تک ناکافی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم سائنس کا دائرہ اثر کافی محدود ہے اس کا مشاہدہ سطحی اور اس میں صلاحیت نہیں کہ وہ حقیقت کی تہہ تک سفر کر سکے۔

دراصل جب مغرب نے مذہب یعنی روحانیت سے منہ موڑا اور جدیدیت یعنی مادیت اور سائنس کے دامن میں پناہ گزیں ہوئے تو انھوں نے پہلا دعویٰ یہ کیا کہ روح کچھ بھی نہیں یہ محض انسانی واہمہ ہے۔ اہل مغرب نے روح سے انکار کسی دلیل یا علم کی بنا پر نہیں کیا بلکہ اُس کی وجہ تجرباتی سائنس کی روح تک نارسائی اور ناکافی غیر موزوں آلات کا استعمال تھا۔ دراصل اہل مغرب اسرار فطرت کی نقاب کشائی سائنس کے ذریعے کرنا چاہتا تھے مگر وہ بھول گئے کہ سائنس تو محض ایک علم ہے جب کہ خالق کل عالم کا مالک ہے اور اُسی کا علم ہے جو لامحدود ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ دوسری طرف مشیت ایزدی یہ تھی کہ اعلیٰ حقائق کو انسانی ادراک کی براہ راست گرفت سے باہر رکھا جائے۔ یہی حکمت اور مصلحت تھی اور حکم ہمیشہ خالق ہی کا ہے۔ چنانچہ جب سائنس روح کے اسرار تک نہ پہنچ سکی تو اُن کم فہموں نے اسے سائنس کی محدودیت نہ جانا بلکہ روح کے انکار کو مناسب سمجھا اور یہی بات اُن کی ضلالت اور انکار کا باعث بن گئی اور انھوں نے آخری نتیجے کے طور پہ اس بات کا علان کر دیا کہ روح نامی کسی چیز کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ الغرض آج کی جدید اور بزعم خویش مہذب دنیا علمی جہالت کا وہ شاہکار ہے جس میں دورِ جدید کا انسان مبتلا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جدید یورپ قدیم یونانی تہذیب کا وارث ہے اور یہ تہذیبی ورثہ رومن ایمپائر کی وساطت سے یورپ تک پہنچا۔ قدیم یونانی تہذیب میں انسان اور اس کے دیوتاؤں کے باہمی تعلقات کی بڑی بھیانک تصویر پیش کی گئی ہے۔ یونانی دیومالا کے مطابق انسان اور اُس کے دیوتا ہمیشہ ایک دوسرے کے دشمن رہے۔ مورخین نے انسان اور یونانی دیوتاؤں کے مابین مستقل ٹکراؤ اور کھینچا تانی کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ

قدرت کے سربستہ رازوں کو افشا کرنے میں انسان کو جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ اُن کے نزدیک انسان کے عزم واستقلال اور دیوتاؤں کی عاجزی اور بے بسی کا اظہار ہیں۔اُن کے مطابق اگر اُن کے دیوتاؤں کا بس چلتا تو وہ کبھی انسان کو تحقیق واکتشاف کے کسی شعبے میں کامیاب نہ ہونے دیتے اور انسان اِن ساری آسائشوں اور سہولتوں سے محروم رہ جاتا جو قدرت کے خزانوں پر دسترس پانے کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں ۔اِس یونانی نقطہ نظر سے سائنس کی ہر نئی کامیابی اپنے حاسد دیوتاؤں کے خلاف انسان کی فتح وکامرانی کا نیا اعلان اور اُس کی برتری کا اثبات ہے۔یونانی تہذیب کی یہی وہ خبیث روح ہے جو جدید یورپ کے تحت الشعور میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے ۔اس کا اظہار کہیں تو حقائق وواقعات کی تعبیر وتوجیہہ میں ہوتا ہے اور کہیں خدا کے بارے میں یورپی رویے میں ۔یہی وجہ ہے کہ جدید یورپی سائنس دان سائنس کی کامرانیوں کو کچھ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ گویا یہ انسان نے کسی برتر قوت سے لڑ کر حاصل کی ہیں اور اُن کے نتیجے میں فطرت کی قوتوں کو اپنا تابع فرما بنا لیا ہے۔چنانچہ اُن دیکھے خداؤں کے سامنے انسان جس عجز و نیازمندی کا اظہار کرتا چلا آیا ہے اس کی اصل وجہ اس کے نزدیک انسان کا احساس عجز ہے۔مگر سائنس کو فطرت کے خلاف جو بے پناہ کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں اُن کے نتیجے میں یہ انسانی احساس عجز رفتہ رفتہ خود بخود مٹ جائے گا اور بالآخر وہ دن بھی آئے گا جب انسان خود اپنا خدا ہوگا مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو حیات وممات کے تمام سربستہ راز معلوم ہوں اور وہ تجربہ گاہ حیات میں تخلیق کی صلاحیت حاصل کرلے۔

انسان تخلیق کے امر پر قادر ہو جائے گا یہی آج کی سائنس کی نقطہ منتہا ہے۔اس لیے آج کا سائنس دان تجربہ گاہ میں زندگی کی تخلیق کو جس معیار کی اولیت دے رہا ہے وہ کسی دیگر امر کو حاصل نہیں۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آج کی دنیا میں اگر اُسے خدائی کا دعویٰ کرنا ہے تو اسے یہ سنگ میل عبور کرنا ہی ہوگا اور اس کے بعد انسان اور کسی اُن دیکھے خدا میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جائے گا اور انسان کو اپنے سوا کسی کے روبرو جھکنے کی ضرورت نہ رہے گی ۔جدید مغربی دنیا آج جن روحانی امراض میں مبتلا ہے اُن میں یہ مرض سب سے زیادہ خطرناک ہے ۔اور اُن کے اس جنون نے انسان کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے انسانیت کو افتراق وانتشار میں جھونک دیا ہے، زندگی میں امن و

سکون اور اطمینان باقی ہے نہ حسن و دلکشی۔ چنانچہ مغرب کے یہ سب پست تخیل اور آخری حد تک پھیلا ہوا اخلاقی بگاڑ اُس کو کسی منزل کی طرف نہیں لے جائے گا۔ بلکہ وہ جس دلدل میں اتر چکا ہے وہ آگے جا کر مزید گہری ہو جائے گی۔ یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ ہم نے ایک ارب سے زائد بت پرستوں اور دو ارب کے قریب ملحدین کا تذکرہ نہیں کیا تو انھیں معلوم ہو کہ زندگی کا جو طریق اِن لوگوں نے اپنایا وہ اہل مغرب سے چنداں مختلف نہیں خالق کے وجود سے انکار یا خالق کے احکامات سے انکار ایک ہی قبیل سے ہیں۔ چنانچہ گمراہی اور اخلاقی پستی میں ہندو اور کیمونسٹ اہل نصاریٰ سے کئی قدم آگے ہیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ مغرب دراصل ایک استعارہ ہے اور اس دائرہ میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو خود کو سیکولر کہتے ہیں۔ چونکہ نظریات جغرافیائی سرحدوں کے پابند نہیں ہوتے اس لیے مشرق ہو یا مغرب انسانوں کا جو بھی گروہ سیکولر نظریات کا حامی ہوگا وہ گمراہ تصور ہوگا اور اُسے اہل مغرب ہی کہا جائے گا۔ چنانچہ اِن گمراہ قوموں کے سامنے اب صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اسلام کے دامنِ عافیت میں پناہ حاصل کر لیں۔ کیونکہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ قدیم زمانوں میں اول اول انسانی حماقت بت پرستی کی صورت ظاہر ہوئی اب سائنس کو خدا مان کر پھر سے اُسی جاہلیت کا اعادہ کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جب تک قدیم اور جدید خرافات سے خود کو آزاد نہ کر لے تب تک اسے حقیقی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اسلام ہمیشہ سے زخمی روحوں پر مرہم رکھتا چلا آیا ہے۔ آج بھی اسلام کا دامن وا ہے اور مغرب کو اس ضمن میں کسی رکاوٹ کا بھی سامنا نہیں اس لیے کہ وہ ایک غالب قوم ہیں اسلام ہی سائنس اور مذہب کی اس مزعومہ کشمکش کو مصالحت میں بدل سکتا ہے۔

اسلام ہی انسانیت کے شرف کی بحالی کے لیے آخری جائے پناہ ہے، اسلام ہی امید کی واحد کرن ہے، اسلام ہی اس مصیبت زدہ دنیا کی امن و سلامتی کو بحال کر سکتا ہے جو مغرب کی حماقتوں کے طفیل انسان سے چھن چکی ہے۔ بے خدا مغرب کی تباہ کاریوں سے نجات کے لیے قانونِ خداوندی کی اطاعت کے سوا اب کوچارۂ کار نہیں۔ اسلام انسان کو زندگی گزارنے کا ایک صحت مند پروگرام فراہم کرتا ہے۔ اسلام انسان پر اس امر کو واضح کرتا ہے کہ دنیا میں تجھے جو علمی مادی اور روحانی کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں وہ دراصل تمھارے رب و رحیم کا فضل و کرم ہیں۔ اسلام انسان کو یہ پیغام دیتا ہے

کہ اپنی کامرانیوں کو تم ابنائے نوع کی خدمت کا ذریعہ بناؤ گے تو تمھارا خالق تم سے خوش ہوگا اور تمھیں انعام سے نوازے گا۔ یاد رہے کہ تمھارا رب حصول علم کی لگن یا اسرارِ فطرت کی جستجو سے غضبناک نہیں ہوتا کیونکہ خالق کو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اُس کی مخلوق میں سے کوئی اپنے علم کی بنا پر اُس کی خدائی کے لیے خطرہ بن سکتا ہے بلکہ خالق کا غضب صرف اُس وقت بھڑکتا ہے جب انسان اپنے علم وفضل اور سائنسی معلومات کو ابنائے نوع کی بربادی کا ذریعہ بنالے۔ اسلام کا دامن عافیت ہر اُس انسان کو سلامتی اور امن کی دعوت دیتا ہے جس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود ہو چنانچہ خدا کرے کہ اہل مغرب بھی عصبیت وتعصب کے اندھے غاروں سے باہر نکلیں اور کھلے دل سے سچائی کا اعتراف کریں اُن کے سامنے کامیابی کی یہ واحد صورت ہے ورنہ انھوں نے جس تصور کامیابی کو اپنایا ہوا ہے خود اُن کے اندر سے اب اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ حقیقی کامیابی صرف خالق کے سامنے سر جھکانے میں ہے اور ناکامی خالق سے بغاوت کا نام ہے۔

فکری انحطاط؛

انسان جب شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اُس کے سامنے کئی منزلیں کئی اہداف نمودار ہوتے ہیں۔ اگر وہ فکری انحراف کا شکار ہوگا اپنے خالق سے بے نیاز ہوگا، بغیر کسی الہامی رہنمائی کے اپنے اہداف کو مقرر کرے گا تو یقیناً اُس کا اٹھنے والا ہر قدم اُسے منزل سے دور ہی لے جائے گا۔ چاہے وہ کچھ ظاہری اہداف کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تب بھی وہ منزل سے کوسوں دور ہوگا اس لیے کہ خالق کی رضا تو اس میں تھی کہ انسان اُس جنت کی کھوج میں لگ جائے جہاں سے اُسے شیطان نے نکلوا دیا تھا۔ وہ اپنے خالق کی رضا کو پا لے اُس کی منشا کو جان لے اور اپنی زندگی کو خالق کی اطاعت اور رضا کے حصول میں گزارے تب وہ اُن دنیاوی اہداف کو بھی حاصل کر لے گا جن کا تخیل اُس کے ذہن میں موجود ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی کامیابی اُس کا مقدر بنے گی کہ حقیقی کامیابی تو صرف آخرت کی کامیابی ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے فریضہ رسالت کو تندہی سے سرانجام دیا تو اس کے نتیجے میں ایک مختصر عرصے میں آپ ﷺ نے انسانی فکر کی تطہیر فرما دی اُس کو راہ مستقیم پہ استوار کر دیا۔ چنانچہ فکری اور عقائدی طور پہ درست اور پختہ یقین کے

حامل یہ لوگ جب اللہ کا پیغام دنیا تک منتقل کرنے کے لیے سرزمین عرب سے باہر نکلے تو بڑی بڑی عظیم الشان ریاستوں نے اُن کے سامنے اپنے سر کو جھکا دیا۔ دنیا کی کوئی رکاوٹ فوجوں کی مہیب تعداد، عقیدہ و فکر کا اختلاف غرض کوئی بھی دنیاوی رکاوٹ حق کے اس سیل عظیم کا راستہ نہ روک سکی اور لوگ دور دور تک اللہ کے پیغام سے آگاہ ہوگئے اور اس پیغام کی دلکشی اُن کے دلوں میں اتر گئی۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں کلام مقدس میں ارشاد فرمایا گیا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ۔

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 110/3)

ترجمہ؛

تم لوگوں کی اچھی جماعت ہو جس کو لوگوں کے بیچ اٹھایا گیا کہ تم لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتے ہو اور برائی سے اُن کو منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“۔

☆☆☆☆☆☆

چنانچہ ایک ہزار سال تک دنیا کی بیشتر آبادیوں پر حاملین قرآن ہی کا سکہ چلتا تھا۔ وہی لوگوں کے لیے حق اور باطل نیکی اور بدی کا معیار بن کے رہ گئے تھے۔ اگرچہ تب وہ بہت سی عملی اور اعتقادی گمراہیوں کا شکار بھی ہو چکے تھے مگر اُن کی بنیادی فکر اُن کی رہنمائی کے لیے ہمیشہ موجود رہی۔ چنانچہ ابتلا اور انارکی کے کسی بھی دور میں مسلمان فکری انتشار کا لقمہ نہیں بنے اور نہ ہی انھوں نے توحید کا دامن چھوڑا جس کی وجہ سے بہت سی کمزوریوں کے باوجود بھی لوگوں کی قیادت اور سیادت انھی کے ہاتھ میں رہی۔ مسلمانوں کے معاشروں میں اگرچہ شر کا وجود ایک زندہ حقیقت کی طرح ہمیشہ موجود رہا ہے مگر مسلمانوں کی فکری برتری اور کتاب مقدس کی موجودگی کی وجہ سے شر کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا اور وہ اپنی موجودگی کے باوجود معاشرے میں اُس فکری اور عملی فساد کو جنم نہیں لینے دیتا جس طرح کہ اہل مغرب کے ہاں ہوا کہ اُن کے فکری انحراف نے اُن کے سماجی اور عقائدی ڈھانچے کی

دھجیاں بکھیر کے رکھ دیں اور وہ جاہلیت کی اُس وادی میں جا اترے جہاں اُن کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ چنانچہ فکری تصحیح کے لیے آج بھی وہی نسخہ کیمیا کامیاب ہے جس نے پندرہ سو سال پہلے انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا اور اُن کی فکر کو راہ مستقیم پہ ڈال دیا۔ آج مسلمان معاشرے بظاہر کئی پہلوؤں سے مغلوب نظر آتے ہیں تاہم، اخلاق، عمل، عقائد اور فکری محاذوں پر آج بھی اُن کی برتری قائم ہے اور وہ اہل مغرب کی نام نہاد مہذب تہذیب کے لیے کھلا چیلنج بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسلام اس حقیقت کو کھول کر بیان کر دیتا ہے کہ خیر اور کامیابی اسی میں ہے کہ انسان خالق کے احکامات کے سامنے اپنے سر کو جھکا دے دوسری صورت میں اُس کی دنیا اور آخرت دونوں اللہ کے عذاب کی زد میں آ جائیں گے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ!

فَمَن تَبِعَ هُدَایَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (38) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَO

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/38-39)

ترجمہ:

”تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی اُس کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی غم اور جنھوں نے میری بات کو جھٹلا دیا اور نافرمانی کی تو وہی لوگ آگ میں ڈالے جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ الاعراف میں ارشاد ہوا کہ!

سَاءَ مَثَلاً الْقَوْمُ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَأَنفُسَهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ (177) مَن يَهْدِ اللّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي وَمَن يُضْلِلْ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (178) وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا

مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لاَّ يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لاَّ يَسْمَعُونَ بِهَا أُوْلَئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُوْلَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 7/179-177)

ترجمہ:

''حقیقت یہ ہے کہ جولوگ ہماری ہدایت سے انکار کرتے ہیں اُن کی حالت بہت ہی بری ہے اورحق سے انکار کرنے کی پاداش میں خود انھی کا نقصان ہے۔اللہ جس کو ہدایت دیتا ہے وہی ہدایت پانے والا ہے اور انکار کرنے والا ہمیشہ کے خسارے کا شکار ہو گیا۔اور ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہت بڑی تعداد کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔جن کے پاس دل ہیں مگر وہ سوچتے نہیں، اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں، یہ لوگ جانور ہیں بلکہ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں اور اُس کی وجہ اُن کی غفلت ہے۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ الاعراف میں ہی ارشاد ہوتا ہے کہ!

قَالَ عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاء وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ (156) الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالأَغْلاَلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُواْ بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُواْ النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ

أُولَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (157) قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ يُحْيِـي وَيُمِيتُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 156-158/7)

ترجمہ:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنا عذاب اُسی پر نازل کرتا ہوں جس پر عذاب نازل کرنا چاہتا ہوں اور میری رحمت تو سب کو محیط ہے۔ اور میں ضرور اپنی رحمت اُن لوگوں پر نازل کروں گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں، زکواۃ دیتے ہیں اور ہمارے احکامات پہ سر جھکاتے ہیں۔ اور جو لوگ رسول اُمی کی اطاعت کرتے ہیں جس کو وہ اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات و انجیل میں تو رسول اللہ ﷺ اُن کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو اُن کے لیے حلال بناتے ہیں اُن پر سے وہ بوجھ اور بندشیں دور کرتے ہیں سو جو لوگ ہمارے نبی کی اطاعت کرتے ہیں اُن کی حمایت کرتے ہیں اُن کی مدد کرتے ہیں اور اُس ہدایت کی پیروی اختیار کرتے ہیں جو اُن کے ساتھ بھیجی گئی تو یہی لوگ ہیں جو پوری طرح کامیاب قرار پائیں گے۔ آپ فرما دیجئے کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں جس کی بادشاہی زمینوں اور آسمانوں کو محیط ہے۔ اُس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت اتارتا ہے۔ سو اللہ پر ایمان لاؤ اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس ہدایت کو اختیار کرو جو اللہ کے رسول کی طرف اتاری جارہی ہے تاکہ راہ حق کو تمھارے لیے کشادہ کر دیا جائے"۔ (۱۹)

☆☆☆☆☆☆

اگرچہ انسانی فکر کی اصلاح کے لیے پورا قرآن ہی دستاویز ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے مگر نمونے کی اِن چند آیات پہ بھی اگر نگاہ تدبر دوڑائی جائے تو ہدایت حاصل ہو جانے اور فکر راست ہونے جانے

کا قوی امکان موجود ہے۔ انسان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ فکری طور پہ وہ راہ راست پہ ہو اس لیے کہ عمل کا دارومدار ہی فکر پہ ہے جب فکر راست ہوگی تو عمل بھی درست ہوگا اگر فکر غلط ہوگی تو انسانی عمل اُس عمارت کی طرح گر جائے گا جس کی بنیاد ٹیڑھی تھی اور جونہی وہ ذرا بلند ہوئی تو دھڑام سے گر گئی۔ پیام بہت واضح ہے جس میں کوئی ابہام نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء انسان کو ایک ہی نقطہ کی طرف بلاتے رہے جسے توحید کہا جاتا ہے چنانچہ فرمایا گیا کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شرک مت ٹھہراؤ۔ ایک لاکھ سے زائد پیامبر اسی بنیادی پیغام کی تجدید کے لیے اترتے رہے۔ مگر حیرت ہے کہ انسان ہمیشہ سے انکار پہ اڑا رہا اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا رہا۔ آج کے لوگ خود کو مہذب کہتے ہیں خود کو عقل مند اور صاحب دانش قرار دیتے ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں انسان نے اپنی زندگی میں عقل کے سہارے اس قدر سہولیات اور آسائشات پیدا کر لی ہیں کہ اُس کو بے عقل تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا مگر یہ انسانی زندگی کا مادی پہلو ہے جس میں اُس نے ترقی کی۔

اُس کا روحانی پہلو نہایت تشنہ ہے اس لیے کہ NASA میں بیٹھنے والا امریکی خلا باز بھی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے تو چاند کی سرزمین پہ اترنے والا اور دور خلائی اسٹیشنوں میں مہینوں گزارنے والا خلا نورد بھی اللہ کی حقیقت سے اُسی طرح نا آشنا ہے جیسے کہ ہندوستان کے دور دیہات میں بسنے والا بتوں کا کوئی پجاری۔ وال اسٹریٹ جنرل میں بیٹھنے والا تاجر جو دنیا کی تجارت کو لمحوں میں کسی بحران کے حوالے کرنے پہ قادر ہے وہ بھی اللہ کی حقیقت سے آگاہ نہیں تو ناروے اور آسٹریلیا کے ساحلوں پر عریاں بدن عورتیں بھی اللہ کی منشا سے منہ موڑے ہوئی ہیں۔ چین کا نہایت محنتی کاشتکار اور روس کا فوجی بھی اللہ کی ہدایت سے انکاری ہے بلکہ وہ تو کسی اللہ کے وجود سے ہی انکاری ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ بظاہر کچھ مادی میدانوں میں کامیابی حاصل کر لینے کے باوجود انسان گمراہ ہو سکتا ہے۔ لہراتی روشنیوں اور تیز رفتاری سے دوڑتی ٹریفک اور ہواؤں کو چیرتے ہوائی جہاز انسان کی کامیابی کے ضامن ہرگز نہیں ہیں اس لیے کہ اللہ کے نزدیک یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ بڑا کارنامہ تو صرف اور صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے، جنت کا حقدار بننا ہے۔ آخرت میں کامیابی حاصل کرنا ہے چاہے اُس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے، چاہے اُس کامیابی کے عوض اس دنیا کی زندگی کس

قدر ہی دشوار کیوں نہ ہو جائے۔ چنانچہ انسان کو سوچنا چاہیے کہ اُسے کیوں پیدا کیا گیا ہے اور اُس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، کیا مادی کامیابی کا حقیقی کامیابی سے کوئی تعلق ہے اس بات کو سوچنے سے ہی فکری اصلاح کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد عمل درست بنیادوں پہ خود ہی استوار ہو جائے گا اس لیے کہ مضبوط اور سیدھی بنیادوں پہ اٹھائی جانے والی عمارت کبھی نہیں گرتی اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمائے۔

روح اور مادہ

آج کی جدید سائنس نے انسان کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ انسان محض ایک مادی وجود ہے اور کائنات کی مادی تشریح کے بعد لوگوں کا ایک کثیر گروہ اس امر پہ ایمان بھی لے آیا ہے کہ انسان محض ایک مادی وجود ہے۔ کائنات کی مادی تشریح کی کمزوریاں کسی اور مقام پہ بیان کر دی گئی ہیں یہاں ہم صرف یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ انسان محض ایک مادی وجود نہیں ہے بلکہ وہ روح و خاک کا امتزاج ہے۔ چنانچہ وہ نہ تو محض خاک ہے کہ اسے جمادات و حیوانات میں شمار کر دیا جائے اور نہ ہی وہ صرف روح ہے کہ فرشتوں میں مل جائے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خاک و روح کے امتزاج نے ہی اسے کائنات کی دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز مقام فراہم کیا ہے۔ دراصل مغرب نے جب مذہب سے دوری اختیار کی تو ہر معاملے میں اُن کی یہی کوشش رہی کہ وہ مادیت کو روحانیت پر غالب کر دیں۔ اس لیے انھوں نے انسان کے اخلاقی وجود کا انکار کیا اور اسے محض مادی وجود قرار دینے کے درپے ہو گئے۔ اسلام کی نظر میں انسان ایک مربوط ہم آہنگ اور غیر منقسم

وجود ہے۔اس کے خاکی اور اجزائے روحی میں کوئی انفصال نہیں ہے بلکہ اس کے فکر و عمل میں ہم آہنگی، عمل و اخلاق میں ارتباط، مثالیت و واقعیت میں پیوستگی ہے، عقیدہ و شریعت، دنیا اور آخرت میں تسلسل ہے۔الغرض انسان جسم اور روح، فکر و عمل، عقیدہ و قانون، دنیا و آخرت ایک وحدت ہیں اور انسان اِن وحدتوں کا متوازن اور معتدل مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں نہ تو جسم کو روح پر غلبہ دیا گیا ہے اور نہ واقعیت کو خیال پر حاوی کیا گیا ہے، نہ انفرادیت پسندی کو اجتماعیت پر فوقیت دی گئی ہے بلکہ سلبیت کو ایجابیت پر اور دنیا پر آخرت کو ترجیح دی گئی ہے۔انسان کے اسی متوازن تصور سے فرد اور معاشرہ متوازن ہوتے ہیں، اُن کے افکار و اعمال میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کا پیش کردہ یہ واضح اور روشن تصور انسان کے قلب و ضمیر میں جگہ بنالے تو اُس کی پوری زندگی جادۂ حق پر گامزن ہوجائے گی اور یہ احساس انسانی ضمیر کی متاعِ کُل ہے کہ وہ کائنات میں کسی خاص اہمیت کا حامل ہے۔اگر انسان کو محض ایک مادی وجود قرار دے لیا جائے اور اُس کے اخلاقی وجود کا انکار کر دیا جائے تو یہ متاعِ فخر اُس سے چھن جاتی ہے اور وہ مقامِ شرف سے ایک دم حیوانات کے مقام پہ اتر آتا ہے اور یہی آج کی جدید مادیت کی عطا ہے کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔اسی نظریہ نے انسان سے احساسِ شرف چھینا اور اُس کو حیوانی سطح پر لے آیا جہاں کوئی اخلاقی قانون، کوئی سماجی ضابطہ اُسے خواہشِ نفس پوری کرنے سے نہیں روکتا۔اس لیے کہ اُس کے پاس رُک جانے کے لیے کوئی جواز نہیں ہے، نہ وہ کسی خالق کا قائل ہے کہ اُس سے ڈر جائے اُس سے خوف کھائے۔اور نہ اُس کے سماج نے وہ اخلاقی قدریں وضع کی ہیں جن کی پیروی میں وہ ایک پاکیزہ اور حلال زندگی گزارے۔چنانچہ خالق کی اس کائنات میں انسان کا حقیقی مقام کیا ہے اور اُس کی زندگی کے اعلیٰ مقاصد اُس کی رہنمائی عمل کی کن راہوں کی طرف کرتے ہیں اِن کا جواب الہامیات میں ہے اور اللہ کی واحد محفوظ الہامی کتاب جو اس وقت موجود ہے وہ صرف قرآن ہے، اس لیے انسان کی مجبوری ہے کہ ہدایت کے لیے وہ قرآن ہی کو حرفِ آخر جانے ورنہ وہ ہدایت سے محروم رہے گا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا○

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل 70/17)

ترجمہ:

''ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی، اور اُسے خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اور اُس کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضلیت بخشی''۔

☆☆☆☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے اس بات کو کھول دیا کہ انسان زمین کی تمام مخلوقات سے برتر ہے اور اُسے عزت کا مقام عطا کیا گیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ عزت کا مقام اطاعت میں ہے اطاعت سے خارج ہونے کی صورت میں انسان اور حیوان کا فرق مٹ جائے گا اور ایسا انسان جانور قرار پائے گا بلکہ عقل کی موجودگی کے باوجود اگر وہ خالق تک نہیں پہنچ سکا تو وہ جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ!

لَهُمْ قُلُوبٌ لاَّ يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لاَّ يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لاَّ يَسْمَعُونَ بِهَا أُوْلَـئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 178-179/7)

ترجمہ:

''اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ سوچتے نہیں، اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ سنتے نہیں اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں، یہ لوگ جانور ہیں بلکہ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں اور اُس کی وجہ اُن کی غفلت ہے''۔

☆☆☆☆☆☆

فیصلہ ہوگیا کہ اگر انسان نے حیوانی سطح سے انسانی سطح پر منتقل ہونا ہے اور شرف کی زندگی بسر کرنی ہے تو

اُس کے لیے اُسے خالق کی اطاعت کرنا ہوگی، اُس کے احکامات کی تعمیل کرنا ہوگی، اُس کے رسولوں پر ایمان لانا ہوگا، اُس کی کتابوں پر عمل کرنا ہوگا یہی وہ واحد طریقہ ہے جس پر عمل کر کے انسان خود کو کائنات کی دیگر مخلوقات سے ممتاز کر سکتا ہے اور اس دنیا اور پھر آخرت کی دنیا میں عزت کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ لعنت ہو اہل مغرب پر جنھوں نے انسان کو محض لذت حاصل کرنے کی مشین قرار دیا ہے اور انسانی زندگی کا مقصد صرف لذت کا حصول بتایا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے بت میں اپنی روح پھونکی تو فرشتوں نے اُس کو سجدہ کیا۔

ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ (30) وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاء كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلاَئِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاء هَؤُلاء إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (31) قَالُواْ سُبْحَانَكَ لاَ عِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (32) قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ (33) وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلاَئِكَةِ اسْجُدُواْ لآدَمَ فَسَجَدُواْ إِلاَّ إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (34) وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْظَّالِمِينَ (35) فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُواْ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ

O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/35-30)

ترجمہ:

''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انھوں نے کہا! اے ہمارے رب کیا تو اُس کو زمین میں اپنا نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا، اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اُس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا، اگر تم سچے ہو تو مجھے اِن چیزوں کے نام بتاؤ؟ انھوں نے کہا' پاک ہے تیری ذات ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھایا ہے، اور تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا! اے آدم اِن فرشتوں کو اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ پس جب آدم نے فرشتوں کو اُن چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا' میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو مجھے اُن سب کا علم ہے۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اُن سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکنا کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ مگر شیطان نے اُن کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اُس سے اُن کو نکلوا دیا''۔

☆☆☆☆☆☆

اِن آیات سے یہ بات کھل گئی کہ انسان بندر کی اولاد نہیں بلکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے اور اُس میں اپنی روح پھونکی ہے۔ اُسے یہ شرف عطا فرمایا کہ اسے اُس علم سے مزین کیا جسے

فرشتے تک نہ جانتے تھے۔اس کے بعد جب اللہ کے حکم سے انحراف کی بنا پر جنت انسان کے ہاتھ سے نکل گئی اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پہ اتار دیا تو اُس سے کہا میری رضا حاصل کرنے میں لگ جاؤ، میرے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرنا تو میں تمہیں وہ مقام پھر سے عطا کردوں گا جس سے تمہیں نکالا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کو ایک اخلاقی محور عطا کر دیا گیا جس کے گرد اُس کی زندگی نے گھومنا تھا اور وہ تھا خالق کی رضا کا حصول۔

تاہم چونکہ شیطان ایک زندہ حقیقت ہے اور ایک سائے کی طرح انسان کے ساتھ لگ گیا ہے اس لیے اُس نے انسان کو گمراہ کرنے کے نت نئے طریقے ایجاد کر لیے۔اُس نے دنیا کی خوشنمائی کو انسان کے سامنے اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ انسان حق کی راہ سے بھٹکنے لگا۔تب اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے انبیاء و رسل کو زمین پر بھیجا جو لوگوں کو شیطان سے جال سے نکالنے میں منہمک ہوگئے۔انھوں نے لوگوں کو حق کی طرف دعوت دی۔لوگوں کو بتایا کہ ہم ہدایت پر ہیں ہماری پیروی کرو۔ہماری پیروی کرنے سے نہ صرف تمھاری دنیا سنور جائے گی بلکہ آخرت بھی سنور جائے گی اور تم لوگ روزِ محشر کی رسوائی سے بچ جاؤ گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ!

وَلَوْ تَرَى إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو رُؤُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحاً إِنَّا مُوقِنُونَ (12) وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (13) فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا إِنَّا نَسِينَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (14) إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّداً وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ○

القرآن الحکیم (سورۃ سجدہ 12-15/32)

ترجمہ؛

’’آپ فرمادیجئے کہ موت کا فرشتہ تمھاری جان قبض کرتا ہے جسے تم پر مقرر کردیا گیا ہے تاکہ تم لوٹ کر میری طرف آو۔ کاش تم اُس وقت دیکھتے جب یہ مجرم اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے کھڑے ہوں گے اور کہیں گے کہ اے میرے پروردگار اب ہم نے دیکھ لیا اب ہم نے جان لیا تو ایک بار ہمیں پھر دنیا میں بھیج دے اور یقین رکھ کہ اس بار ہم اچھے عمل کریں گے مگر کہا جائے گا اب تم اپنے اُن اعمال کا مزہ چکھو کہ تم نے ہمارے پاس لوٹ آنے کو بھلادیا تھا۔ اب کے ہم نے تم کو بھلادیا ہے پس ہیشگی کے عذاب کا مزہ چکھو اپنے اعمال کے بدلے میں جو تم دنیا میں کرتے رہے ہو‘‘۔

☆☆☆☆☆☆

اِن آیات میں اس بات کو واضح کردیا گیا ہے کہ انسان کو موت کی حقیقت کبھی نہ بھلانی چاہیے ورنہ اُس کو نہایت بدترین انجام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ یہ دنیا دارالعمل ہے، سعی اور کوشش کی جگہ ہے۔ اور آخرت کی زندگی انعام حاصل ہونے کی جگہ ہے، نیکی اور بدی کے پھل اور اعمال کے بدلے کا گھر ہے، انسان کو موت کی گھڑی تک اس دنیا میں عمل کی مہلت ہے۔ موت کی گھڑی کے ساتھ ہی یہ مہلت ختم ہوجائے گی، لہٰذا اس عرصہ حیات میں انسان کا اٹھنے والا ہر قدم، اُس کا گزرنے والا ہر لمحہ، اُس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ، غرض ہر انسان کا ہر عمل ہر بھلائی ہر برائی اپنا ایک اثر اپنا ایک وزن رکھتا ہے جس کو محشر کے روز تولا جائے گا اور انھی اعمال کی بنا پر نجات یا عذاب کا فیصلہ کیا جائے گا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ!

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ○ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الزلزال 6-8/99)

ترجمہ؛

''تو جو شخص دنیا میں ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ روزِ محشر اُسے دیکھ لے گا، اور جو شخص دنیا میں ذرا برابر بھی برائی کرے گا تو وہ اُسے بھی آخرت میں دیکھ لے گا''۔

☆☆☆☆☆☆

اللہ تعالٰی نے لوگوں پر ایک مزید احسان یہ کیا ہے کہ روزِ محشر اُس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمھارے باپ نے یہ گناہ کیا ہے، تمھارے بیٹے نے یہ گناہ کیا ہے، بلکہ اُس سے صرف یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ گناہ کیوں کیا ہے؟ چنانچہ اس انفرادی حیثیت میں اُس کا حساب لینا اللہ کا احسان ہے اگر انسان سے پورے سماج کا حساب لیا جاتا تو انسان شدید دشواری کا شکار ہو جاتا۔ لیکن اسی امر کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ انسان اپنی انفرادی حیثیت اور ذمہ داری کا بھی احساس رکھے اور اپنے ہر عمل سے پہلے سوچے اور جانے کہ اس عمل کا حساب بھی اُس نے اکیلے ہی دینا ہے اس سے احساس ذمہ داری بڑھ جاتا ہے اور انسان اپنے عمل کے نتائج کے بارے میں محتاط ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار انسان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ تمھارے گناہ کا بوجھ تمہیں پر ڈالا جائے گا لہٰذا محتاط ہو جاؤ۔ نمونے کے طور پہ محض چند آیات تحریر کی جاتی ہیں تا کہ انسان کے اخلاقی وجود ہونے پہ ہمارا استدلال مستحکم ہو جائے۔ اللہ غارت کرے مغرب کے اُن بے عقلوں کو جنھوں نے لوگوں کو اللہ سے دور کیا اور روزِ محشر سے بے پرواہ کر دیا۔ انسان کو گناہ سے بچنا ہے کیونکہ اس کا بار بھی اُسی کے کندھوں پر ہے۔

ارشادِ باری تعالٰی ہے کہ!

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى۔

القرآن الحکیم (سورۃ فاطر 18/35)

ترجمہ؛

"کوئی شخص کسی دوسرے کا بار گناہ اپنے سر نہ لے گا اور اگر کسی پر بڑا بار ہوا اور وہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے کسی کو بلائے تو کوئی اُس کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوگا، خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے کہ!

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْماً لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئاً۔

القرآن الحکیم (سورۃ لقمان 32/31)

ترجمہ؛

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اُس دن کا خوف کرو جب کہ نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کام آئے گا"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ روم میں فرمایا کہ!

مَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحاً فَلِأَنفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ روم 30 /44)

ترجمہ؛

"جس نے کفر کیا اُس کے کفر کا وبال اُسی کے سر ہے اور جس نے نیک عمل کیا تو ایسے لوگ اپنی بہتری کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں"۔

☆☆☆☆☆☆

سورہ المائدہ میں ارشاد ہوتا ہے!

عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 105/5)

ترجمہ؛

''تم پر تمھارے اپنے نفس کی ذمہ داری ہے اگر تم ہدایت پاؤ تو دوسرا گمراہ ہونے والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا''۔

☆☆☆☆☆☆

قرآن حکیم کی اِن آیات سے یہ سبق حاصل ہو رہا ہے کہ دنیا میں ہر انسان پر فرداً فرداً اُس کے تمام اچھے اور برے اعمال کی ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ نہ یہ امید رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے، نہ اس توقع کے لیے کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطہ سے ہم اپنے جرائم کی پاداش سے بچ جائیں گے اور نہ اس خطرہ کا کوئی موقع باقی رکھا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہمارے حسن اعمال پر اثر انداز ہوگا۔ اور نہ ہی اس بات کا کوئی امکان ہے کہ خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نامقبولیت میں کوئی دخل ہوگا۔ چنانچہ جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے والے کو جلنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی یا شہد کھانے والے کو شرینی کے احساس سے کوئی شے روک سکتی ہے۔ نہ جلنے کی مضرت میں کوئی شخص اُس کا شریک و سہیم ہو سکتا ہے نہ شرینی کی لذت سے کوئی دوسرا اُس کو محروم کر سکتا ہے۔ اسی طرح بدکاری کے نتیجہ بد اور نیکوکاری کے نیک انجام میں بھی ہر شخص بجائے خود منفرد ہے۔ لہٰذا دنیا کو برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہوئی زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ انسان اپنے ہر عمل کا ذمہ دار خود ہے۔ اُس کی برائی کا وبال بھی تنہا اُسی پر ہے اور اُس کی بھلائی کا فائدہ بھی وہ خود ہی اٹھانے والا ہے۔ یہ پختہ اصول ہی انسان کو ذمہ دار اور مفید شہری بناتا ہے انسان کا خلوص دل کے ساتھ نیک عمل کرنے کی جدوجہد ہی دراصل اُس کی اصل کامیابی ہے۔ تاہم حرص و ہوس، لالچ و طمع اور مسابقت انسان کے عمل کو راہ مستقیم سے ہٹا دیتے ہیں۔ انسان کی روحانی غذا کسی

معبود کی عبادت ہے۔ تاہم جسمانی زندگی گزارنے کے لیے اُسے مادی وسائل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر انسان اِن دونوں پہلوؤں میں توازن قائم رکھنے میں عام طور پر کامیاب نہیں ہوتا۔ کبھی وہ عبادت میں اس طرح کا غلو کرتا ہے کہ دنیا چھوڑ کر جنگلوں اور ویرانوں میں نکل جاتا ہے، تو کبھی اپنے مادی تقاضوں کو اس حد تک بے لگام چھوڑ دیتا کہ زندگی کی ہر سانس ہر لمحہ مادی ترقیات کے حصول میں خرچ کر دیتا ہے۔ یاد رہے کہ عمل میں یہی عدم توازن اس دنیا میں اور آخرت میں انسان کے خسارے کا باعث بنتا ہے۔ دیکھیں کہ دنیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک اربوں انسان ہیں جو زندگی کو اس طرح بسر کر رہے ہیں کہ انھیں نہ موت یاد ہے یا نہ اللہ کے سامنے پیش ہونے کا ڈر ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جہاں نفس نے انسان کو بہکایا ہے وہیں بہت سے صاحبِ دانش ہیں جنھوں نے اپنی تحریوں اپنی تقریروں اور اپنی تحقیقات سے اس بات کا واویلا کیا ہے کہ یہ کائنات بغیر کسی خالق کے یونہی محض ایک اتفاقی دھماکے کے نتیجے میں وجود میں آ گئی تھی اور اس کے بعد اسباب کا ایک تسلسل ہے جو نظام کائنات کو تھامے ہوئے ہے اور ایک سبب کی بنا پر دوسرا سبب معرض وجود میں آ جاتا ہے اور یوں سلسلہ کائنات اپنے روز و شب کی تکمیل کر رہی ہے اور یہ کہ دنیا لذت کے حصول کی جگہ ہے اور اس زندگی سے جس قدر ممکن ہو لذت کشید کر لینی چاہیے۔

چنانچہ انسانی زیست کے لیے کسی اخلاقی ضابطے کسی الہامی قانون کی پیروی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب یہ تخیل پختہ ہو جائے تو لوگ جوابدہی کے کسی بھی احساس سے تہی زندگی گزارتے ہیں اور مہلت عمل ختم ہونے کے بعد ردائے خاک اوڑھ لیتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ لوگ بھی بے گناہ ہی جہنم کی آگ بن گئے ہیں اس لیے کہ انھیں تو کسی نے حقیقت سے آگاہ ہی نہ کیا تھا تو یہ ایک کھلا جھوٹ ہوگا اس لیے کہ انسان اپنے کاروبار کے پھیلاؤ، تعلقات کے فروغ دولت کے حصول اور معیارِ زندگی کے بارے میں کس قدر ہوشیار ہے اور اُس کے پاس کس قدر معلومات ہیں۔ اُس کے سامنے ایک سکرین کھلی ہے جس پر دنیا جہان کی معلومات اُس کی اضطرابِ انگشت کی منتظر ہیں تب وہ حق سے کس طرح ناآشنا رہ سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان کی گمراہی میں اُس کی خواہش نفس ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے وہ مضطرب ہے دولت اور دنیا بھر کی نعمتوں کو حاصل کرنے کے باوجود مضطرب ہے اس لیے کہ اگر انسانی روح تشنہ ہو تو جسم یقیناً مضطرب ہوگا تاہم اگر

اُس کی روح مطمئن ہے تو جسم لاغر اور بوسیدہ ہونے کے باوجود مضطرب نہ ہوگا۔ اللہ ہماری رہنمائی فرمائے۔ آمین

حقیقت و سراب

بعض لوگوں کو گمان گزرا ہے کہ آتی جاتی سانسوں کا نام ہی زندگی ہے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ لذت کے زیادہ سے زیادہ لمحات کا حصول ہی اصل مقصدِ زیست ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ دولت کا زیادہ سے زیادہ حصول ہی اصل زندگی ہے۔ زندگی کے بارے میں یہ پست اور شرمناک گمان انسانیت کا سر شرم سے جھکائے دیتے ہیں۔ سراب منزلوں کے یہ راہی حقیقت کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں اور سایہ کو حقیقت قرار دینے پر مصر ہیں بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے لوگوں کے اس گروہ کو دنیا کے دوسرے لوگوں پر کچھ سماجی، معاشی اور عسکری برتری بھی حاصل ہے جس کی بنا پر اِن لوگوں نے راہ حقیقت کے مسافروں کا مضحکہ اڑایا ہے اور اُن کے دکھ اور مصیبتوں کو اُن کی ناکامی کا سبب بتایا ہے۔ حالانکہ حقیقت اُن کے گمان سے بہت دور کھڑی ہے اور خسارے کی جس منزل کے وہ راہی ہیں اُس کی طرف مراجعت سے بڑی بدقسمتی کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ حقیقت اور سراب میں بہت فرق ہے۔ حقیقت آئینے کی طرح شفاف ہے مگر وہ آئینہ اپنی روشنی اُنھی لوگوں تک منعکس کرتا ہے جو اُس کی جستجو میں سرگرمی دکھائیں۔ حقیقت چل کر انسان

کے پاس نہیں آئے گی بلکہ انسان کو حقیقت تک چل کے جانا ہوگا۔ خدا کی تلاش اگر چہ کچھ مشکل نہیں مگر خدا کی تلاش کا ارادہ تو ہو۔ خدا لوگوں کے نزدیک مذاق بن کے رہ گیا ہے، خدا کی حقیقت سے لوگوں کا جو قلیل گروہ واقف ہے دنیا میں اُن کو اچھوت بنا کے رکھ دیا گیا ہے اور اُن کی زبان سے نکلا ہوا دعوت کا کوئی بھی لفظ دقیانوسی اور روایت پسندی قرار دے کے رد کر دیا جاتا ہے۔

چمک دمک، طاقت اور دولت، سائنس اور عسکریت کے میدانوں میں برتر انسانوں کے اس گروہ نے حقیقت کا انکار کیا ہے۔ خدا کی موجودگی کا انکار کیا ہے، خدا کی حاکمیت کا انکار کیا ہے، خدا کے احکامات سے منہ موڑا ہے، خدا کے رسولوں کو تکلیفیں پہنچائی ہیں، خدا کے رسولوں کی دعوت کو ٹھکرایا ہے، خدا کی رحمت کو وہمہ قرار دیا ہے، خدا کے عذاب سے انکار کیا ہے۔ اگر اُن کے بس میں ہوتا تو لوٹ کر خدا کے پاس جانے سے بھی انکاری ہو جاتے مگر خدا نے زندگی اور موت کا نظام اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس لیے چاہے کوئی کتنا ہی غلیظ کیوں نہ ہو خدا کی رحمت سے زمین آخر کار اُسے ڈھانپ ہی لیتی ہے تا کہ اُس کو ایک روز خدا کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ خدا سے انکار کرنے والا گروہ اس جدو جہد میں مصروف ہے کہ وہ موت کو شکست دے کر خدا پرستوں کی آخری دلیل بھی ختم کر دے اور جیت ساری اُن کے لیے ہو جائے حالانکہ یہ ممکن نہیں اس لیے کہ باجود اپنی عظیم سائنسی رفعتوں کے انسان مچھر کا ٹوٹا ہوا پر بھی جوڑنے پہ قادر نہیں ہوسکا تاہم اس کا تکبر اپنی جگہ برقرار ہے اور وہ خدا سے دست و گریباں ہے حالانکہ یہ اُس کا مقام نہ تھا جس کو اپنی بدقسمتی اور تکبر کی بنا پر اُس نے چن لیا۔

خدا ہے یا نہیں؟

یہ صرف ایک مذہبی مسئلہ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی فلسفیانہ سوال ہے۔ یہ اس کائنات کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور پوری زندگی اور تمام انسانوں سے متعلق ہے۔

ہم کیا ہیں؟

ہم کیوں ہیں؟

ہم کہاں سے آئیں؟

ہم نے کہاں جانا ہے؟

زندگی کا مقصد کیا ہے؟

کامیابی کی راہ کون سی ہے؟

ناکامی کی راہ کون سی ہے؟

یہ انسانی زندگی کے چند بنیادی سوال ہیں جو شعوری ارتقا کے ساتھ ہی انسان کا تعاقب کرتے چلے آئے ہیں۔ جن لوگوں نے تو اللہ کے رسولوں کا اثبات کیا، اُس کے رسولوں کی پیروی کی، اُس کے رسولوں کے احکامات کی تکمیل کی انھوں نے تو اِن سوالوں کے تشفی بخش جواب پا لیے مگر ہمیشہ سے اور آج بھی دنیا کی کثیر آبادی کی آنکھوں اور دلوں پر پڑے پردے نے انھیں علم وحی سے بے نیاز کر رکھا ہے جس کی وجہ سے اربوں لوگ آج بھی اِن سوالوں کا جواب کھوج رہے ہیں۔

سب سے پہلے یہ اہم بات جان لیں کہ زمین کے سینے پر صرف تین قسم کے لوگ بستے ہیں۔ دنیا کے تمام لوگ چاہے کسی بھی خطے میں رہتے ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، کسی بھی قومیت کے حامل ہوں، کالے ہوں گورے ہوں، گندمی ہوں یا زرد ہوں۔ مندرجہ ذیل تین میں سے ایک قسم میں ضرور شامل ہوں گے کہ اِن تین قسموں کے سوا انسانوں کی کوئی اور قسم پائی ہی نہیں جاتی۔ اور وہ تین قسمیں یہ ہیں۔

۱۔ وہ جو ایک خدا کو مانتے ہیں۔

۲۔ وہ جو ایک سے زیادہ خداؤں کو مانتے ہیں۔

۳۔ وہ جو کسی خدا کو نہیں مانتے۔

ہم یہاں اِن تینوں قسم کے لوگوں کے تخیلات اور اُن کے تخیلات کے پس منظر میں موجود عقلی دلائل سے بحث کریں گے۔ اگرچہ آخرالذکر دونوں قسموں کے پاس کسی بھی قسم کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہے اور وہ محض ضد پہ اڑے ہوئے ہیں۔ تاہم یہ بات اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ اُن کی مہیب تعداد خطہ ارض پہ سینہ تانے چلتی ہے اور اپنی جہالت پہ نازاں بھی ہے۔ جب ہم اِن لوگوں کے تخیلات پہ نظر کرتے ہیں تو جانتے ہیں کہ اول انھوں نے کائنات کی غلط تشریح کی، دوم انھوں نے انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو جاننے میں ٹھوکر کھائی جس کی وجہ سے اُن کا اٹھنے والا ہر قدم جاہلیت اور انکار کی طرف ہی بڑھتا رہا۔ وہ کیا سوچتے ہیں اس سوال کو جاننے سے قبل اس بات کا جاننا از حد

ضروری ہے کہ وہ کائنات کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کیا یہ کائنات اور نوع انسانی کسی خالق کی تخلیق ہے جس نے اسے کسی اعلیٰ مقصد اور منصوبے کے تحت بنایا ہے یا یہ سب کھیل تماشا ہے؟؟؟
مقصد کائنات کے تعین کے بغیر کامیابی اور ناکامی کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اگر خالق نے یہ کائنات کسی منصوبے کے تحت بنائی ہے تو اُس کے منصوبے کا اصل علم بھی خالق ہی کے پاس ہو گا۔ لیکن اسی سوال کا جواب اگر عقل سے تلاش کیا جائے تو وہ جواب یقیناً اُس جواب سے مختلف ہوگا جو خالق نے انسانوں کو بتایا ہے اس لیے کہ خالق کا علم اور انسانی عقل کے مابین کوئی نسبت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل آج تک اس سوال کا کوئی جواب دے ہی نہیں سکی زیادہ سے زیادہ جو بات انسانی علم میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کائنات ایک دھماکے سے وجود میں آئی تھی اور اسباب کا ایک سلسلہ ہے جو نظم کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ تاہم علل و اسباب کے اس کھیل میں پہلا سبب کیا تھا سائنس اور عقل اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔
چنانچہ اس کا جواب خالق ہی دیتا ہے کہ میں نے یہ کائنات اس لیے پیدا کی تا کہ جن اور انسان میری عبادت کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے انکار یا اقرار کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے نظر انداز کر کے زندگی سے تعلق رکھنے والے کسی بھی سوال کا تشفی بخش جواب پایا جا سکے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بہت ہی ناگزیر سوال ہے کیونکہ اسی سوال کے جواب پر پوری انسانی زندگی کی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس سوال پر ایک لمحہ غور کیے بغیر پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ تاہم اگر ذرا گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو صورتِ حال مختلف نظر آئے گی جس شخص کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہ ہوتا ہو کہ خدا اور اُس کی مرضی بھی کوئی شئے ہے اور کبھی اس کا خیال بھی آتا ہو تو اسے فضول اور لایعنی سمجھ کر دل و دماغ کے دریچے بند کر لیتا ہو، ایسا شخص خدا کو بہر حال نہیں مانتا اور غیر شعوری طور پہ ہی سہی لیکن وہ یہ بات طے کر چکا ہوتا ہے کہ یہ محسوس کائنات اور اس کے مادی مظاہر ہی اُس کے لیے کافی ہیں۔
اس کائنات کے ماسوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں ہے جس کی رضا اور غضب کے تصور نے اسے بے چین کیا ہو ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے علمی اور عقلی انداز میں مظاہر زیست کا مشاہدہ نہیں کیا مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ کتنے لوگ ہیں جو اپنے مسائل کو علمی اور عقلی انداز میں حل کرنا

پسند کرتے ہیں لوگوں کی اکثریت کا معاملہ تو اُس ریوڑ کی مانند ہی رہا ہے جس کو چرواہا جس طرف چاہے ہانک دے۔ چنانچہ اٹھارویں انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنا سارا علمی استدلال اس نقطے پر مرکوز کر دیا کہ لوگو کوئی خدا نہیں، کوئی آخرت نہیں۔ کوئی جواب دہی نہیں، بس وہی کچھ ہے جو کچھ تمھاری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ لوگ دراصل یہ بھی کہنا چاہتے تھے کہ کوئی موت نہیں ہے مگر وہ یہ کہہ نہ سکے کہ کائنات کی دیگر حقیقتوں کو انھوں نے جس طرح لفظوں کے گورکھ دھندے، نظریات کے بند لفافوں اور عقلیات کے دھوکے میں لوگوں تک منتقل کیا موت کو وہ اس طرح شکست دے نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سکوت اختیار کیا۔ مگر اُن کا یہ سکوت نقصان کا باعث نہ ہوا اس لیے کہ لوگوں کی اکثریت اُن کے مادی نظریات کو قبول کرنے کے لیے پہلے ہی تیار بیٹھی تھی اس لیے بھی کہ اس نظام زیست میں نفس کے لطف و لذت کا بہت وافر سامان موجود تھا اور شیطان انسانوں کی کثیر آبادیوں کو پہلے ہی لطف و لذت کے اِن جہانوں کی طرف متوجہ کر چکا تھا۔ بعض لوگ زندگی کے اِن بنیادی سوالوں سے کتراتے ہیں اور زندگی کے مسائل کو درمیان سے حل کرنا چاہتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ انسانی زندگی کو درپیش مسائل میں معاشیات اور سیاسیات جیسے اہم مسائل حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد وہ اِن مسائل کا عقلی حل بھی بیان کرتے ہیں اگر چہ وہ بھی کچھ زیادہ تشفی بخش نہیں ہوتا۔

تاہم ذہن میں رہے کہ یہ حد درجہ خطرناک رہنمائی ہے، سیاست یا معاشیات کی خواہ کچھ بھی اہمیت ہو بہر حال وہ کُل زندگی نہیں بلکہ کُل زندگی کے اہم اجزا ہیں اور ہمیں کُل زندگی کا حل تلاش کرنا ہے۔ لوگوں کی اس قسم کی یہ نشانی یاد رکھیں کہ یہ بار بار سائنس کو خدا ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ بات بات میں سائنسی ترقیات کا حوالہ دیں گے سائنسی دریافتوں پر اتھلاتے پھریں گے حالانکہ وہ خود سائنس کی اصل حقیقت سے ناواقف ہوں گے۔ وہ سائنس کی اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہوں گے کہ سائنس تو کائنات کو ایک وحدت تسلیم کر چکی ہے اور اس بات کا اظہار بھی کیا جا چکا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم اور پیچیدہ تر نظام بجائے خود کسی خالق کے وجود پر شہادت پیش کر رہا ہے۔ دوسری طرف بعض نادانوں نے دولت کے ارتکاز اس کے صحیح استعمال اور معاشی آسودگی میں ہی انسان کی نجات تلاش کی ہے۔ عام طور پر اِن لوگوں کو اشتراکی کہا جاتا ہے۔ اشتراکیت کے علمبردار

لوگوں کو دوہرا دھوکا دیتے ہیں۔عوام کے غم وغصہ سے بچنے کے لیے یہ لوگوں سے کہتے ہیں ہمیں تمھارے خدا سے کوئی غرض نہیں تم چاہے ایک خدا کی پوجا کرو چاہے سو خدا بنالو ہم تو تمھارے معاشی مسائل حل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔وہ لوگوں سے کہتے ہیں بے شک خدا کو مانتے رہو مگر کیمونزم اختیار کرلو۔اب کوئی اُن سے پوچھے کہ جس نظام کی پہلی اینٹ ہی خدا کے انکار پہ رکھی ہو اسے اپنا کر کوئی کیونکر کسی خدا کا احسان مند رہ سکتا ہے۔جب کوئی اُن سے پوچھے کہ تمام اساطین اشتراکیت چاہے وہ مارکس ہو، لینن ہو، انجلز ہو یا سٹالن ہو سب کے سب خدا کے منکر تھے تو وہ کہتے ہیں یہ اُن کا ذاتی مسئلہ ہے ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت کے لیے انکارِ خدا کی وہی حیثیت ہے جو کسی عمارت کے لیے اُس کی بنیاد کی ہوسکتی ہے۔اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت کے نقطہ نظر سے انسان کا معاشی مسئلہ ہی وہ مرکزی مسئلہ ہے جس کے گرد پوری انسانی زندگی گردش کرتی ہے۔اس کے نزدیک سماج کے عقائد ونظریات معاشی حالات وواقعات کے تابع ہیں اس لیے اشتراکیت وقت کے غلط معاشی نظام یعنی سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہے اور دنیا میں موجود لوگوں کی اکثریت کو اُن کا معاون بن جانا چاہیے عام طور پہ وہ لوگوں کو مزدور کہہ کے بلاتے ہیں۔

چنانچہ بظاہر اشتراکی نظریات سے بعض سطح بین افراد کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اشتراکیت کا دائرہ کار معاشیات تک محدود ہے۔اشتراکیت کا پروپیگنڈہ کرنے والے بھی اس غلط بیانی سے پردہ نہیں اٹھاتے بلکہ اس معاملے کو جوں کا توں چھوڑ دیتے ہیں کہ اسی میں اُن کا مفاد پوشیدہ ہے۔اشتراکیت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ چونکہ کائنات مادہ سے وجود میں آئی ہے اور یہاں جو کچھ بھی ہے وہ مادہ ہے اور مادہ سے ماوراء یہاں کوئی حقیقت نہیں یعنی کوئی خدا نہیں اس لیے مادی ومعاشی مسائل کے حل میں ہی انسانیت کی نجات اور خوشی پوشیدہ ہے۔یہاں نجات سے مراد غربت ہے اس سے کوئی آخرت کی نجات مراد نہ لے کہ اُن کے نزدیک جب کوئی خدا نہیں تو آخرت کا کیا مطلب؟؟؟

حقیقت یہی ہے کہ اشتراکی فلسفے کو مادہ پرستی اور الحاد سے الگ رکھ کے نہیں دیکھا جا سکتا۔چنانچہ کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ اگر خدا ہے تو مادہ اور مادی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل نہیں رہتے اس کے بجائے خدا کو اور خدا کی مرضی کو خدا کے قانون کو اہمیت حاصل ہوگی اس صورت میں کسی نظریہ یا کسی

عمل کے حق ہونے کا معیار یہ نہیں ہو گا کہ وہ وقت کے معاشی مسائل سے ہم آہنگ ہو جیسا کہ اشتراکی فلسفہ میں سمجھا جاتا ہے بلکہ تب ہدایت الٰہی ہی حق کا واحد معیار قرار پائے گی کہ جو امر خالق کی منشا سے ہم آہنگ ہے وہ حق ہے اور جو اُن کی منشا کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔ اگر اس تخیل کو اپنا لیا جائے تو اشتراکیت کی ساری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے اس لیے اشتراکیت کو بغیر کسی تکلف کے فلسفہ الحاد قرار دیا جاسکتا ہے اور الحاد محض ایک معاشی مسئلہ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا۔

اسی تخلیل کو ایک دوسرے منظر میں دیکھئے جسے عرف میں جمہوری نظام کہا جاتا ہے۔ غور کرنے سے یہ بات جلد ہی کھل جاتی ہے کہ لادین جمہوریت کا معاملہ بھی اشتراکیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ نظام افراد کو اس بات کا حق تو دیتا ہے کہ وہ چاہیں تو خدا کی پرستش کریں چاہیں تو نہ کریں مگر وہ خدا کے اس حق کو خدا سے چھین لیتا ہے کہ وہ بندوں کے معاملے میں دخل دے۔ وہ خدا کا یہ حق خدا کے بجائے پارلیمنٹ کو سونپ دیتا ہے جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ نظام بحیثیت ایک نظام کے خدا کو نہیں مانتا۔ جیسا کہ 1928ء میں امریکہ کی دستور ساز اسمبلی نے شراب پینے کو جائز قرار دے دیا کہ یہ انسان کا حق ہے۔ چنانچہ اس نظام کے حق میں جو زیادہ سے زیادہ نرم بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ نظام انسان کو ایک ایسے خدا کی پرستش کی اجازت دیتا ہے جو انسان کی رہنمائی کرنے سے عاری ہے یا اس منصب سے معزول یا دستبردار ہو چکا ہے (معاذ اللہ)۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت جہالت کے اندھیروں میں ہے۔ خدا کو اگر مانتی بھی ہے تو اس طرح کہ ماننے کا حق ادا نہ ہو۔ دنیا میں قائم اُن نظاموں پہ نگاہ دوڑائیں جن کے زیر سایہ انسانوں کی اکثریت اپنی زندگیاں گزار رہی ہے تو آپ جانیں گے مسلمان مغلوب ہونے، منتشر ہونے، سیاسی انارکی کا شکار ہونے، معاشی طور پہ بدحال ہونے اور مغرب کی تقلید کے باعث اس قابل ہی نہیں رہے کہ اُس نسخہ کیمیا کو اپنے ہاتھوں پہ اٹھا کر لوگوں سے کہہ سکیں کہ یہ ہے انسانیت کی فلاح کا واحد حل۔ اور وہ یہ اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود قرآن پہ عمل کرنے سے گریزاں ہیں۔

58 مسلمان ممالک میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں براہ راست غیر سودی معیشت کا نعرہ اس بنا پہ لگایا گیا ہو کہ خدا سود سے روکتا ہے اس لیے ہم نہ سود لیں گے نہ سود دیں گے۔ بلکہ اس کے برعکس مسلم ممالک کہتے ہیں کہ چونکہ عالمی نظام معیشت سودی ہے اس لیے مجبوراً ہمیں بھی اُس نظام کا حصہ بننا پڑ

رہا ہے۔ نہ شریعت کا نفاذ کسی مسلم حکمران کا مطمع نظر ہے نہ اللہ کی رضا اُن کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک خدا کو ماننے والے اس گروہ کا تذکرہ یہاں عارضی طور پہ موقوف کیا جاتا ہے کہ آنے والے مضامین امت مسلمہ کے زوال پر کچھ مباحث تحریر کرنے مقصود ہیں جہاں اِن امور کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا کہ حامل قرآن ہونے کے باوجود ہم لوگوں کو کیوں نہ بتا سکے کہ انسانیت کے ہر دکھ، ہر مصیبت، ہر پریشانی، ہر آفت، ہر دِقت، ہر مشکل، ہر مسئلے کا حل اس کتاب میں موجود ہے؟؟؟

یہاں ہم اشتراکیت اور لادین جمہوریت پر بحث کر رہے ہیں۔ دیکھیں کہ اشتراکیت اور لادین جمہوریت کا تعلق بھی براہ راست خدا کے انکار یا اقرار سے جڑا ہوا ہے اور اِن نظاموں کے حق یا باطل ہونے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے قبل یہ امر ناگزیر ہے کہ انسان کا ذہن خدا کے معاملے میں یکسو ہو چکا ہو۔ کیونکہ اگر آپ واقعتاً خدا کو مانتے ہیں تو آپ اشتراکیت سے انکار کر دیں گے اس لیے کہ اشتراکیت کی بنیاد ہی خدا کے انکار پہ رکھی ہے۔ اسی طرح اگر آپ خدا کے سچے پرستار ہیں تو آپ لادین جمہوریت سے بھی انکار کر دیں گے اس لیے کہ آپ کسی ایسے خدا کو ماننے کے لیے قطعی تیار نہ ہوں گے جو آپ سے اپنی پرستش تو کراتا ہو مگر زندگی کی پر پیچ راہوں میں آپ کی مدد کو نہ لپکے، مصیبت اور دکھ میں آپ کی دُعا پہ کان نہ دھرے، چنانچہ اس تقسیم سے یہ بات تو ظاہر ہو گئی کہ یا تو آپ خدا کو ماننے والے ہیں یا پھر آپ خدا کے انکار کرنے والے ہیں اور یہی دو گروہ ہیں جو خطہ ارض کی مہیب آبادیوں میں بستے ہیں۔ چنانچہ ہم یہاں انھی انسانی نظریات پہ بحث کر رہے جن کی بنا پر اُس نے کائنات کی عقلی اور مادی تشریح کو اپنا لیا ہے اور کائنات کے کسی خالق کو نظر انداز کر دیا ہے جس سے اُن کی زندگیوں میں اُس خلا نے جنم لیا ہے جو نہ اشتراکیت کے مادی فلسفے سے پر ہوا اور نہ لادین جمہوریت اس کی تشفی کر سکی۔ تو آخر اس تشنگی کا حل کیا ہے۔ کیا یہ سوچ کی غلطی ہے موقف کی کوتاہی ہے یا شیطان کا دھوکا ہے۔ منکرین خدا جب خدا کو نہیں مانتے تو یقیناً وہ کسی شیطان کو بھی نہیں مانتے حالانکہ دراصل وہ اسی کے پجاری ہیں۔ تاہم چونکہ شیطان کوئی مادی وجود نہیں رکھتا اس لیے وہ شیطان کا بھی انکار کرتے چنانچہ باقی صرف موقف کی غلطی رہ جاتی ہے۔ یاد رہے کہ موقف کی غلطی یا اس کے اشتباہ سے سائنس کے عظیم میدان میں بھی غلط نتائج نکل سکتے

ہیں اور یہ نتائج دوررس یا عظیم بھی ہو سکتے ہیں مگر ضروری نہیں کہ کسی سائنسی غلطی کی سزا پوری انسانیت کو بھگتنی پڑے۔لیکن اگر یہی غلطی خدا کے ہونے یا نہ ہونے کے مسئلہ میں ہو جائے تو اس کے نتائج کس قدر ہولناک، کتنے دوررس اور کس قدر عظیم ہوں گے اس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔تاہم اس کے کچھ عکس ضرور دیکھے جا سکتے ہیں جیسا کہ گذشتہ چند سالوں میں صرف امریکی ڈالر ایمپریل ازم کو برقرار رکھنے میں کس قدر انسانی خون بہا اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔اخباری رپوٹوں کے مطابق امریکہ کی عراق پر فوج کشی کے نتیجے میں وہاں دس لاکھ سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے جن میں چار لاکھ وہ بچے بھی شامل ہیں جن کی عمریں نو سال سے کم تھیں اور وہ نہیں جانتے تھے کہ ڈالر ایمپریل ازم کیا ہے نہ وہ یہ جانتے تھے کہ اُن کے گرم خون سے کس ملک کی معاشیات کو استحکام پہنچ رہا ہے، کس کے سامان تعیش میں اضافہ ہو رہا ہے کس نجس ذہن نے اُس کے خون کو اپنی خواہشوں کی آبیاری کے لیے استعمال کیا ہے۔

افغانستان میں بھی تو وہی عفریت گھوم رہا ہے جو انسانی خون کا پیاسا ہے جس کی پیاس بجھنے میں ہی نہیں آتی اس لیے کہ اُس کی پیاس اُس کے جسم کی پیاس نہیں ہے بلکہ اُس کی پیاس اُس کی روح کی پیاس ہے جسے وہ خون سے بھی نہیں بجھا سکتا اگر چہ وہ اس کا تجربہ کرتا رہتا ہے۔خیر ہم ذکر کر رہے تھے اُن لوگوں کا جنھوں نے کہا کہ خدا نہیں ہے اور وہ اس پر بضد ہیں۔خدا ہے یا نہیں یہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے اور اس کے اثرات پوری زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔اس گمان میں غلطی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ پوری انسانی زندگی غلط ہو کے رہ جائے۔زندگی کا ہر شعبہ غلط رخ اختیار کر لے اور تمام تر مادی ترقیات کے باجود نوع انسانی ہلاکت وخسران کی قربان گاہ پہ بھینٹ چڑھا دی جائے۔موجودہ دور میں ہم اسی مصیبت عظمیٰ سے دوچار ہیں اس لیے کہ بدقسمتی سے دنیا کی زمام کار انھی بدبختوں کے ہاتھ میں ہے جو خدا کے انکاری ہیں اور وہ خدا کے انکار کی اساس پہ ہی پوری دنیا اور کل جہان کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور اس پہ بضد بھی ہیں۔اس غلط روش کے جو مہلک نتائج نکل رہے ہیں وہ سب کے سامنے ہیں ہم اُن سے بحث نہیں کرتے تاہم اتنا حق تو ضرور رکھتے ہیں کہ اُن بنیادوں کی تلاش میں نکلیں جن پہ الحاد کی یہ عمارت کھڑی ہے۔اہل مغرب اور اشتراکیت پسندوں کے آپسی اختلاف کے باوجود الحادی رویوں میں وہ بہت حد تک مشترک ہیں اور اُن کے جوش و

خروش کو دیکھ کر کبھی کبھی تو یوں گمان ہوتا ہے کہ اُن کے پاس خدا کے نہ ہونے کے بہت سے قطعی اور عقلی دلائل ضرور ہوں گے جن کی بنا پر وہ الحاد کی عظیم ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار ہو گئے ہیں اور اسی قطعیت اور وثوق کے ساتھ دنیا کے دیگر لوگوں کو بھی اپنے نظریات کی طرف بلا رہے ہیں۔ کیا واقعی انھوں نے اسرارِ کائنات میں سے کچھ ایسا کھوج نکالا ہے جس کی بنا پر وہ خود کو خدا کے انکار کا حقدار قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔ کیا واقعی خدا کا انکار کر دینے سے اُن کے تمام مسائل حل ہو گئے ہیں اور کیا خدا کا انکار کر دینے سے اُن کو کوئی ایسا فائدہ ملا ہے جس سے اُن کے مادی اور روحانی مسائل حل ہو گئے ہیں۔ اسی کا سوال کا جواب کھوجنے کے لیے ہم پہلے اُس گروہ کا تخیل پیش کریں گے جو کہتے ہیں کوئی خدا نہیں، ازاں بعد اُن لوگوں کو تذکرہ کیا جائے گا جو ایک سے زیادہ خداؤں کو مانتے ہیں اور آخر میں موحدین کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے گا ایمان اور انکار کی تذکیر کی جائے گی۔ انشاءاللہ!

سائنس خدا نہیں!!!

تاریخ کے ایوانوں میں بھی اگرچہ لوگوں کے ایسے گروہوں کا سراغ ملتا رہا ہے جن کے خیال میں کوئی خدا نہیں سمایا، تاہم اُن کے الحاد اور آج کے ملحدین کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گزرے کل میں انسان نے جہالت میں خدا کا انکار کیا، آج لوگوں نے علم کی بنا پہ خدا کا انکار کیا، کل کے لوگوں نے بغیر کسی دلیل کے خدا کا انکار کیا، آج کے لوگوں نے خدا کے انکار پہ دلیل بھی دی، کل کے لوگوں نے کسی ذاتی منفعت کی خاطر خدا سے انکار نہ کیا، مگر آج کے لوگوں نے ذاتی منفعت کے لیے خدا کا انکار کیا۔ کل کے لوگوں نے کائنات اور انسان کے مابین باہمی تعلق کی تشریح نہ کی بلکہ اپنی شعوری پستی شاید اُن کے الحاد کا باعث بنی۔ آج کے انسان کا دعویٰ ہے کہ اُس نے انسان اور کائنات کے مابین باہمی تعلق کو کھوج لیا ہے جو ایک مادی تعلق ہے۔ اس لیے کائنات کے مادی وجود کی وجہ سے کائنات کی مادی تشریح ہی مناسب ہے اور کائنات کی مادی تشریح میں کسی خدا کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ منکریں خدا کے پاس کوئی عقلی دلیل نہیں وہ محض ایک ضد پہ قائم ہیں شاید اللہ کی مشیت بھی اسی میں ہے آخر جہنم کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔ منکرین خدا

کے دلائل لایعنی ہیں عام طور پہ اُن کا کہنا ہے کہ چونکہ خدا کا کوئی ظاہری اور مادی وجود نہیں ہے جسے وہ آلاتِ محسوسات سے محسوس کر سکیں اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں۔

انھیں خدا کے وجود کا علم نہیں اور وہ اپنے حواس سے خدا کو نہ پا سکے یہ موقف واضح طور پر عدم علم کا موقف ہے مگر انھوں نے عدم علم کو عدم وجود کا مترادف سمجھ لیا ہے اور قطعیت کے ساتھ خدا کا انکار کر دیا ہے۔ حالانکہ عقلی طور پر خدا کو نہ جاننے کی صورت میں خدا کے ہونے کا بھی اتنا ہی قوی امکان ہے جتنا کے اس کے نہ ہونے کا ہے۔ تاہم انسان غور کرنے کے لیے تیار نہیں اور ہدایت چل کر کسی کے پاس نہیں جاتی ہدایت کو خلوص دل کے ساتھ اپنانا پڑتا ہے انسان اگر کسی خالق کو نہیں مانتا اُس کی عبادت نہیں کرتا تو اس سے بھی خالق کی عظمت و رفعت میں کوئی فرق نہ آئے گا صرف انسان راہ سے بھٹک جائے گا اور جو انسان خالق کے وجود سے بے اعتناء ہو خالق کو اُس کے بھٹکنے کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔

خطہ ارض پہ بسنے والے اربوں لوگ شیطان کی پیروی میں اس طرح منہمک ہیں کہ خدا نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے خود کو خدا سے دور کر لیا ہے حالانکہ وہ اس پر قادر نہیں ہیں۔ اُن کی اخلاقی پستی کی انتہا یہ ہے کہ وہ نہ صرف خدا کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ خدا کے ماننے والوں کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ حالانکہ ایک سطحی عقل رکھنے والا شخص بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا اور بات ہے اور کسی چیز کا نہ ہونا اور بات ہے۔ اس بات میں فرق کرنا ہی علم کی کلید ہے۔ علم اور سائنس کا سارا ارتقاء اسی فرق کو ملحوظ رکھنے کی بدولت ہوا ہے اگر انسان اس فرق کو ملحوظ نہ رکھتا تو انسان جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں سے نکل کر علم اور سائنس کی دنیا میں کبھی قدم نہ رکھ سکتا۔ مگر سائنس خدا نہیں جیسا کہ بہت سے خدا ناشناس لوگوں کا خیال ہے سائنس تو محض ایک علم ہے جس میں دوسرے علوم کی سی کوتاہیاں اور کمیاں بھی ہیں۔ سائنس نے کائنات کی جو مادی تشریح کی ہے دراصل تو اُسے عقلی تشریح ہی کہا جائے گا اس لیے کہ عقل کے سوا اور کون سا ذریعہ علم تھا جس کی مدد سے انسان نے کائنات کی مادی تشریح کی ہے۔ مقصدیت اور معنویت تو بہت دور کی بات ہے سائنس کے پاس اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں کہ یہ کائنات اور کیوں کر اور کیسے وجود میں

آئی۔ دیکھیں کہ سائنس کے ذریعے کائنات کے حقیر ترین اجزا کے بارے میں بھی ہم صرف یہ جان سکتے ہیں کہ اُن اجزا کی صفات اور اجزائے ترکیبی کیا ہیں ہم یہ کبھی نہیں جان سکتے کہ یہ صفات اور اجزائے ترکیبی کیوں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج سے پانی بنتا ہے لیکن اِن دونوں گیسوں کے یکجا ہونے سے پانی کیوں بنتا ہے اور پانی میں وہ خصوصیات کیوں نہیں ہیں جو اِن دونوں گیسوں کی بنیادی خاصیت ہے یعنی کہ ہائیڈروجن جلنے والی گیس اور آکسیجن جلانے والی گیس ہے مگر جب یہ ملتی ہیں تو پانی بنتا ہے اور پانی نہ جلتا ہے نہ جلایا جاسکتا ہے بلکہ پانی سے جلتے ہوئے وجود کو بجھایا جاسکتا ہے یعنی یکجائی کے بعد یہ دونوں گیسیں اپنی اصلیت کے الٹ ہو جاتی ہیں۔ آگ جلتی ہے پانی اسے بجھاتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ روزمرہ کی بات ہے کہ سوڈیم اور کلورین کے ملنے سے نمک بنتا ہے جسے ہم کھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سوڈیم ہاتھ لگتے ہی جل اٹھتا ہے اور کلورین ایک زہریلی گیس ہے مگر جب یہ ملتے ہیں تو نمک بن جاتے ہیں تب کلورین کا زہر کہاں جاتا ہے سوڈیم کی آگ سینے کو کیوں نہیں جلاتی۔ یہ محض دو مثالیں ہیں۔ ہر چند کہ سائنس کے ساتھ یہ معاملہ قدم قدم پہ پیش آنے والا معاملہ ہے۔ (۲۰)

مگر سائنس اس کیوں اور کیسے کا جواب دینے سے عاجز ہے اس لیے کہ سائنس وجودات کا علم نہیں ہے وجوادت کی ماہیت کو معلوم کرنے کا علم ہے اور یہ ایک محدود علم ہے۔ سائنس کا دامن اس قدر محدود ہے کہ اتنے چھوٹے چھوٹے کیوں کا جواب بھی نہیں دے سکتی تو کائنات کے سب سے بڑے کیوں کا جواب کیونکر دے سکتی ہے۔ مگر اللہ کی لعنت ہو انسانوں کے اُس جم غفیر پر جنھوں نے قادر مطلق کے مقام پر سائنس کو بٹھا دیا ہے۔ دیکھیں کہ کائنات کی تشریح کے معاملے میں جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ یہ کائنات آیا کسی قادر مطلق کی نشانی ہے یا محض اتفاق سے وجود میں آ گئی ہے کہ اس اتفاق پہ ایمان لانے والے بھی کثرت سے موجود ہیں حالانکہ اُن کا استدلال بھی محض جہالت ہے اور وہ اس کو عقلی استدلال گردانتے ہیں۔ یہ سوال کہ کائنات کیوں وجود میں آئی کیسے وجود میں آئی اور کیونکر اُس کا عظیم نظم رواں دواں ہے اس کیوں کا جواب کانوں سے ڈھونڈھنا، ہاتھوں سے تلاشنا، آنکھوں سے کھوجنا، یعنی حواس سے رازِ کائنات تک پہنچنا کیونکر ممکن ہے جب کہ وہ حقیر حقیر سے سوالوں کے جواب دینے سے بھی عاجز ہے اور لوگ ہیں کہ سائنس کے محدود دائرے میں اور حواس

کے مختصر احساس میں کائنات کے سب سے بڑے کیوں کو تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات کس قدر آسان ہے کہ کسی چیز کو اُس کے خالق کے ذریعے سے ہی جانا جائے کہ اُس سے بڑھ کے اور کون ہوگا جو اس چیز کے متعلق جانتا ہوگا جس نے وہ چیز بنائی ہے۔ مگر عقل کے اِن اندھوں نے جب یہ کہا کہ کائنات کسی نے نہیں بنائی بلکہ خود سے وجود میں آ گئی ہے تو اب وہ اس بات کے سزاوار ہونے سے تو رہے کہ وہ کائنات کے خالق سے کائنات کے بارے میں جانیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کا اقرار ہو یا خدا کا انکار ہو یہ دونوں عقلی نظریے ہیں اور عقلی دلائل کی بنا پہ ہی انھیں صحیح یا غلط ثابت کیا جا سکتا ہے حواس یا آلات کے ذریعے نہ خدا کے وجود کا اثبات کیا جا سکتا ہے اور نہ الحاد کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور یہی کمی تھی جسے خدا ناشناسوں نے محسوس نہ کیا اور اُس منزل کی طرف سفر کرنے لگے جس کا نام تک وہ نہ جانتے تھے۔ خدا کا انکار کرنے والے کبھی یکسو نہیں ہو سکتے اس لیے کائنات کے بارے میں بھی خدا ناشناس کبھی کسی نظریے، کسی نقطے، کسی اجتماعی تخیل تک کبھی نہ پہنچ سکے بلکہ صحرا میں گم اونٹوں کی طرح بے منزل ہی بے مقصد محور کے گرد گھومتے رہے اسی لیے الحاد کے کسی گوشے سے تو یہ آواز آتی ہے کہ!

وہم وخیال سے زیادہ کائنات کی کوئی حقیقت نہیں!

تو کوئی دوسرا کہتا ہے۔ کائنات کبھی پیدا نہیں ہوئی اور نہ کبھی مرے گی!

پھر کسی نے اپنے عقل کی پٹاری کھولی تو آواز آئی، کائنات خود ہی پیدا ہو گئی تھی اور خود ہی چل رہی ہے۔

کائنات کے بارے صاف سیدھا اور سچا نظریہ جو خود خالق کائنات نے انسان کو بتایا وہ یہ ہے کہ کائنات کو اللہ نے پیدا کیا ہے جو قادر مطلق ہے ہر چیز کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور وہی ہے جو اپنی قدرت وحکمت سے اس کائنات کے نظام کو چلا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اُس کو روک سکے، کوئی نہیں جو اُس کے کاموں میں دخل دے سکے، کوئی نہیں جو اُس کی خدائی میں سر اٹھا سکے، کوئی نہیں جو اس کی قدرت میں دخیل ہو۔ وہ لوگ جو خدا کی قدرت قاہرہ کے قائل نہیں اُن کی عقل پہ ماتم کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کائنات پر صرف ایک نظر ڈال لینے سے ہی خالق کے استدلال پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ دیکھیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی مطیع وفرمانبردار ہے، دریا اُس کے حکم کے

مطابق بہتے ہیں، ستارے اُس کی مرضی سے چمکتے ہیں، بادل اُس کے حکم سے برستے ہیں کائنات میں ہر طرف نشونما کا پورا سامان موجود ہے، پیدائش سے لے کر موت تک یہاں کی بے حدو نہایت اشیاء کو انسانی زندگی اور اُس کے ارتقاء کے لیے معاون بنایا گیا۔ ہوا، روشنی، پانی نمکیات و معدنیات کے بے حدوحساب ذخیرے ہیں جو اللہ نے انسان کی خدمت کے لیے مخصوص کر دیئے ہیں اس لیے کہ وہ لوگ جو اللہ کی واحدنیت پر یقین رکھتے ہیں، جن کو اُس شرف کا احساس ہے جو انھیں خالق کی طرف سے عطا کیا گیا ہے یعنی وہ جورب کے حقیقی نائب ہیں اور اللہ کی زمین پر فساد نہیں پھیلاتے بلکہ اُس کی اطاعت کرتے ہیں انھی کی بدولت دراصل اللہ کے انکار کرنے والوں پہ عذاب نہیں آتا اللہ نے انھیں مہلت دے دی ہے اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ مجھ سے بھاگ کے کہیں بھی نہیں جا سکتے اور ایک روز اِن بدبختوں کو اللہ کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔ اور اللہ نے اس کائنات کو ہرگز ہرگز عبث نہیں بنایا اس لیے کہ خالق کوئی بھی کام عبث نہیں کرتا۔

چنانچہ قرآن حکیم ارشاد ہوتا ہے کہ!

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُوْلِي الألْبَابِ (190) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَىَ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ O

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 190-191/3)

ترجمہ:

"بلاشبہ آسمانوں اور زمینوں کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔ جن کی حالت یہ ہے کہ وہ یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے بھی اور وہ غور کرتے ہیں زمین و آسمان کی پیدائش میں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس زمین کو یونہی بلا

مقصد پیدا نہیں فرمایا اس لیے کہ آپ عبث کاموں سے پاک ہیں"۔

☆☆☆

ہمہ پہلو ،ہمہ جہت انکار

دنیا کی ہمہ جہت رونق، بازاروں اور سڑکوں پر گاڑیوں کا ہجوم، فضاؤں میں بلند ہوتے ہوئے چمکتے دمکتے رنگ رنگ کے طیارے۔ رفیع الشان تعلیمی ادارے، وسیع و عریض سڑکیں اور اُن پہ ٹریفک اژدھام، آسمان کو چھوتی بلند و بالا عمارتیں، عالمی سیمینار اور صاحب دانش کی مجلسیں، معاشی طور پہ آسودہ اور عسکری طور پہ مستحکم حکومتیں، لوگوں کی بے نیازی اور مسکراتے چہرے، حسن اور رنگ و نور کی اس بارش سے بہت سے کم فہموں کو یہ شبہ گزرا ہے کہ انسان مہذب ہو گیا ہے اُس نے انتہائے تمدن کو چھو لیا ہے اس لیے اب یا تو خالق کا انکار ہے یا خالق کا اقرار ہے شرک کا کہیں وجود نہیں۔ اس بات کو جاننے کے لیے کہ کیا یہ بات عقلی اور واقعی طور پر اس قابل ہے کہ اس پر یقین کیا جائے اور اس کو سچ قرار دیا جائے کہ دنیا سے شرک مٹ گیا ہے؟ ذیل میں ہم اپنی تحقیق بیان کرتے ہیں۔ جب شیطان موجود ہے تو یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ شرک مٹ جائے۔ حق بات یہی ہے کہ شرک نہ صرف موجود ہے بلکہ اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے، دراصل اس قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے والے لوگوں کا تعلق اُس قبیلے سے ہے جو لذت پرستی میں مگن ہیں اور ساون

کے اندھے کی طرح انھیں ہر طرف ہرا ہرا ہی نظر آتا ہے۔ یہ لوگ اپنی بنیاد اپنے مقصد، اپنے خالق حتیٰ کہ اُس عہد تک کو بھول چکے ہیں جو اُن کی پیدائش سے قبل خالق نے اُن سے لیا تھا۔

کتاب مقدس میں ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الاعراف 172/7)

ترجمہ؛

"اور یاد کرو جب نکالا تمھارے رب نے بنو آدم کو اُن کی پیٹھوں سے اُن کی ذریت کو اور گواہ ٹھہرایا خود اُن کے اوپر اور پوچھا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ وہ بولے ہاں، تو ہی ہمارا رب ہے، ہم اس کے گواہ ہیں، یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کے دن تم اس امر سے مکر جاؤ اور کہو کہ ہم تو بے خبر ہی مارے گئے"۔

☆☆☆☆☆☆

انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل عطا فرمائی کہ وہ اپنے خالق کو جانے اور اُس کی رضا تلاش کرے مگر انسان نے عقل کو غلط استعمال کیا اور خالق کا باغی ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ باغی سے کوئی بادشاہ محبت نہیں کرے گا بلکہ اس سے عناد ہی پالے گا۔ ذرا چند لمحے اپنا منہ اپنے گریبان میں ڈالیں اور سوچیں کہ انسان کے لیے مناسب ہے کہ وہ خالق سے شرک کرے، خالق نے انسان کو پیدا کیا اور ابتدا میں وہ کیا تھا اچھلتے ہوئے گندے پانی کا ایک قطرہ، اس کے بعد اُس کی ماں نے جانے کتنے دکھ سہے کتنے درد برداشت کیے اور اپنے رحم میں اسے اٹھائے اٹھائے پھری اور پانی کے اُس قطرے کو اپنا خون پلا پلا کر بچہ بنا دیا پھر ایک شدید درد کے ساتھ اُسے دنیا میں منتقل کر دیا، اب اُس کی ماں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا جہاں وہ امرت دھارا تھا جہاں اس ننھی سی جان کو زندہ رکھنے کا اہتمام کیا گیا۔ کچھ

عرصہ بعد بچے نے دیکھا کہ اُس کی ماں کے سوا کوئی اور بھی ہے جو اُس سے شدید محبت کرتا ہے، وہ خود نہیں کھاتا بلکہ اس کو کھلاتا ہے، اُسے خود کھانے سے زیادہ اس بات میں لذت آتی ہے کہ وہ لقمہ اُس کا بیٹا کھائے۔ وہ اُس کا باپ ہے جو اُسے ہر خطرے سے بچاتا ہے اور اُسے زندگی کرنے کے گُر سکھاتا ہے پھر وہ بڑا ہو جاتا ہے، اور اُس کا باپ بوڑھا ہو جاتا ہے، اُس کی ماں کو کم دکھائی دینے لگتا ہے تو وہ بیٹا جو کل تک انھی کے سہارے تھا آج اُن سے مستغنی ہو جائے اور کہے میں نہیں جانتا کہ والدین کے حقوق بھی کوئی چیز ہیں۔ مجھ پر اِن دونوں بوڑھوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے مجھے علم نہیں کہ اُن کے کچھ حقوق ہے جو میرے اوپر واجب ہیں تب آپ اُس بیٹے کو کیا کہیں گے۔

یہ غیر تحریر شدہ وہ نوشتہ ہے جو بغیر کسی گواہی کے ثابت ہے اور بغیر کسی مطالبہ کے مسلّم ہے اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کہیں نہیں پڑھا کہ میں بوڑھے والدین کی خدمت کروں۔ غور کریں کہ جب ماں باپ کا حق اس قدر مسلّم ہے کہ اُس کا انکار ممکن نہیں تو اُس کے حقوق فرائض کا انکار کیسے ممکن ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اِن والدین کو پیدا کیا بلکہ اس نوجوان کو بھی تو اُسی نے پیدا کیا ہے اور وہی خالق ہے، جس نے مرد کی سکنیت کے لیے عورت کو وجود بخشا، جس نے خاندان اور قبیلہ کی عصبیت پیدا کی تا کہ انسان اپنی حفاظت کر سکے، جس نے انسان کے اندر اجتماعی شعور کو پیدا کیا تا کہ حکومت و ریاست کا وجود برقرار رہے، جس نے انسان کے اندر خالق کی تلاش و عبودیت کا داعیہ پیدا کیا تا کہ وہ اپنی روحانی تعمیر کر سکے۔

دیکھیں کہ جب ہم ایک گھوڑا خریدتے ہیں اور اُس پہ سواری کرتے ہیں ہم گھوڑے سے کوئی تحریری معاہدہ تو نہیں کرتے کہ جب ہم تجھ پر سواری کریں تو ہمیں منزل مقصود تک پہنچا دینا، یہ ایک غیر تحریری معاہدہ ہوتا ہے کہ ہم جانتے ہیں اگر گھوڑے کو چارہ نہ دیا گیا تو وہ ہمیں منزل مقصود تک پہنچانے کے قابل ہی نہ رہے گا۔ اسی طرح جب ہم گھوڑے مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں، گائے ،گھوڑے اور گدھے تک سے ایک خاموش اور غیر تحریری معاہدہ کرتے ہیں اُن کے استحقاق اور اپنی ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو اس عہد سے ہی ہمیں کیوں انکار ہے جو ہم نے خالق کے ساتھ کیا ہے اور اُس کی تحریر (قرآن) موجود بھی ہے۔ یعنی کس قدر بودی اور بعید از قیاس بات ہے کہ ہم گائے اور گھوڑے کی ذمہ داری سے خود کو بری الذمہ قرار نہیں دیتے مگر وہ خالق نے جس نے گائے

بنائی، گھوڑا بنایا، دشت و چمن بنائے، زمین و آسمان بنائے، دریا اور پہاڑ بنائے، ستارے اور سیارے بنائے، سورج اور چاند بنائے، دن اور رات بنائے، ہوا اور پانی بنائے، آگ اور مٹی بنائی اور سب سے بڑھ کر انسان کو بھی تو اُسی نے بنایا ہے اور انسان اس قدر بے عقل ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود کا ہی انکار کر دے اور خود کو اُس سے بری الذمہ سمجھے۔

پس بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ انھیں تو علم ہی نہیں کہ انھوں نے خالق کے ساتھ کوئی عہد بھی کیا تھا یہ لاعلمی نہیں بلکہ حجت بازی ہے اور جو انسان خواہش کا بندہ ہو نفس کا اسیر ہو وہ یہی کہے گا اس لیے کہ وہ جانتا ہے اللہ تک جو راہ جاتی ہے وہ دشوار ہے اور اُس سے عہدہ برا ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی محبت اور طلب کا جذبہ دے کر اس کی راہ میں خوف اور طمع، رغبت و رہبت کے بہت سے عقبات ڈال دیئے ہیں تاکہ اس کے اختیار و آزادی کا امتحان ہو جائے اور ہر شخص اپنی ہمت اور قابلیت کے ساتھ خدا کے یہاں درجہ اور عزت حاصل کر سکے۔ یہیں عقبات ہیں جو ایک طالب صادق اور ایک بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں، جو اہل ہمت ہوتے ہیں وہ تو ہر پست و بلند، ہر سہل و صعب کو طے کرتے ہوئے خدا تک پہنچ کے ہی دم لیتے ہیں، وہ نہ راہ کے کسی خطرہ کی پرواہ کرتے ہیں نہ کسی طمع کی طرف ملتفت ہوتے ہیں وہ اپنی فطرت کی صدا برابر سنتے ہیں اور اس کی کشش انھیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ تلوے کے آبلوں اور کانٹوں کی جلن اور چبھن کا خیال کر سکیں۔ لیکن جو پست ہمت اور دنی الفطرت ہوتے ہیں وہ انھی عقبات میں سے کسی عقبہ کے پاس ہمت ہار کے بیٹھ جاتے ہیں، بس یہی دنائت اور پست ہمتی ہے جو در حقیقت غیر اللہ کی بندگی اور شرک کا اصلی سبب ہے۔ اب نظریں گما کر ذرا اس دنیا میں جھانکیں اور ہمیں بتائیں کہ اس دنیا میں دنی الفطرت لوگوں کی اکثریت ہے یا صاحب ہمت لوگ اکثریت میں ہیں اسی سے یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ دنیا میں شرک کا پھیلاؤ کس خطرناک حد کو چھو رہا ہے اور اربوں لوگ جہنم کی بھڑکتی آگ کا ایندھن بننے والے ہیں۔ آیئے دنیا کا ایک سرسری جائزہ لیں۔

☆☆☆☆☆☆

اہل مغرب کا ذکر تو اس کتاب میں جا بجا موجود ہے ان سطور میں کچھ مشرقی اقوام کے انحراف اور انکار کا ذکر مقصود ہے۔ چین کو دیکھیں تو ایک ارب سے زائد یہ لوگ بھی گمراہ ہیں، حق کی وادیوں سے دور تو ہم پرستی میں ملوث اس قوم کا بنیادی مسئلہ آبادی اور بھوک رہی ہے۔ وہ دنیا میں سب سے تیزی کے ساتھ بڑھنے والی قوم ہے۔ صدیوں وہ بھوک کا شکار رہے ایک زمانہ تھا جب دو چینی آپس میں ملتے تو حال احوال جاننے کا اُن کے ہاں یہ طریقہ مروّج تھا کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے اُس نے کھانا کھالیا ہے۔ یہی اہل چین آج دنیا کی بڑی بڑی صنعتی طاقتوں کے لیے کھلا چیلنج بن گئے ہیں اس لیے کہ ماؤزے تنگ نے اُن کو کام پہ لگا دیا اور انھیں ایک منزل کی طرف متوجہ کر دیا۔ آزادی کے بعد اس قوم نے جس قدر تیزی سے ترقی کی ہے دنیا اُس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں اُن کا نقطہ نظر دقیانوسی اور توہمات پر مبنی ہے۔ مختصر اتنی سی بات جان لیں کہ وہ خالق کے انکاری اور باغی ہیں۔ اُن کے ہاں زندگی کا تصور بہت پست ہے اور اُن کے مذاہب تمام تر خرافات کا پلندہ ہیں۔ چین میں تین مذاہب کی متوازی طور پر رائج ہیں۔ جن میں تاوی مذہب، کنفیوشزم اور بدھ مت شامل ہیں۔ چین میں قدیم زمانوں سے آباء واجداد اور بھوتوں اور شیطانوں کی پرستش مروّج رہی ہے۔

بدھ مت اگرچہ آباء پرستی کا مذہب نہیں تھا لیکن جب وہ چین میں پہنچا تو وہاں کے قدیم مذاہب نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل چین کے تینوں مذاہب یعنی آباء پرستی، مظاہر پرستی اور شیطان پرستی کے مذاہب ہیں، جادو منتر، سحر اور شعبدے اِن مذاہب کی مشترک خصوصیات ہیں، چینی مذاہب کے اوہام و خرافات کی داستان اس قدر طویل ہے کہ پڑھنے والا تھک جائے مگر وہ ختم ہونے میں نہ آئیں۔

تاوی مذہب کا بانی لاتزوے ہے۔ اس کا اصل فلسفہ نفی کا فلسفہ ہے۔ تاوی فقراء 100 قبل مسیح سے مشرقی سمندر میں پریوں کے ایک جزیرے کے سراغ میں سرگرداں ہیں جہاں شجرۃ الخلد اگتا ہے۔ چینیوں نے سارے آسمان کو دیویوں اور دیوتاؤں سے بھر دیا اور زمین کو شعبدہ بازوں اور جادوگروں کے حوالے کر دیا۔ تاوی مذہب کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ انسان اگر اپنے احساسات کی نفی کرے تو جاوداں زندگی کا راز پا جائے گا اور آسمانی دیوتاؤں میں شامل ہو جائے گا۔ اُن کی آسمانی دیویوں میں

''آسمان کی ملکہ'' یا ''مقدس ماں'' کو سب سے زیادہ عظمت واہمیت حاصل ہے۔یہی سمندروں کی دیوی اور موجوں اور طوفانوں کی ملکہ ہے، ہر چینی ملاح، ہر ماہی گیر، ہر جہاز ران اور ہر بحری سیاح کی محافظ یہی دیوی ہے، جب سمندروں میں اُن کو کوئی مصیبت پیش آتی تو یہ دیوی آسمانوں سے نمودار ہو کر بڑے بڑے طوفانوں کو اپنی تلوار سے کاٹ دیتی اور سمندروں میں راہ گم کردہ جہازوں کو چراغ سے راستہ دکھانا بھی اسی دیوی کی ذمہ داری تھی۔چین کا تیسرا بڑا مذہب کنفیوشس ازم ہے، چین کا اصلی مذہب آباء پرستی ہے اور کنفیوشزم کی حقیقت بھی اس سے زیادہ دور نہیں ہے بلکہ کنفیوشزم آباء پرستی کو سندِ جواز فراہم کرتا ہے۔آباء پرستی چینی مذاہب کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے تاہم اُن کے ہاں سب سے زیادہ عظمت واہمیت مردوں کی ارواح کو حاصل ہے، چین کی اصلی خدائی انھی کے ہاتھ میں ہے۔

یوں تو چینی سارے دیوی دیوتاؤں کو ہی قربانی اور چڑھاوے پیش کرتے ،لیکن سب سے زیادہ صدق دل کے ساتھ وہ اپنے باپ دادا کی ارواح کی عبادت کرتے۔اس لیے کہ اُن کے خیال میں اُن کے آباء کی روحیں زمین پر باقی رہتی ہیں اور اگر اِن کو کھلایا پلایا نہ جائے ،اُن کو راضی نہ رکھا جائے تو یہ ارواح خفا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے اُن پر آفتیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔وہ کہتے کہ جس روح کی اولاد اپنے آباء کی ارواح کی تعظیم و پرستش نہیں کرتی وہ روح ایک ابدی شقاوت کا شکار ہو جاتی ہے۔چنانچہ اس تصور سے چین میں انفرادی ہستی کا تصور معدوم ہو گیا اب ہر فرد اپنے آباء واجداد کے اُس طویل سلسلے کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا ہے جو ابتدائے آفرینش سے لے کر خود فرد کے وجود تک پھیلا ہوا ہے۔

ہزار ہا برس گزر چکے ہیں، چینیوں کے آباء واجداد کے دورِ حجری کی بدویانہ زندگی سے نکل کر دورِ جدید کی حضروی زندگی میں داخل ہو چکے ہیں، پچیس شاہی خاندان ملک پر حکومت کر چکے ہیں، خوفناک جنگوں اور عظیم الشان انقلابات نے ملک کے زمین و آسمان بدل دیئے ہیں لیکن چین کی آباء پرستی روزِ اول سے آج تک بدستور قائم ہے اس میں سر مو تغیر نہیں ہوا۔کنفیوشس نے اگرچہ لوگوں کو بہت سے اخلاقی اصولوں کی بھی تعلیم دی ،لیکن تمام تعلیمات کی بنیاد میں آباء پرستی کو محسوس کیا جا سکتا ہے کنفیوشس نے کہا کہ ہمیں اپنے آباء واجداد کو حاضر ناظر جان کر اُن کی پرستش کرنی چاہیے اور ارواح

کو قربانی پیش کرتے وقت ہمیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ ہمیں دیکھ رہی ہیں۔کنفیوشس نے تو لوگوں کو کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ خدا ہے یا کوئی دیوتا ہے مگر اُس کے مرنے کے بعد لوگوں نے اُسے بھی دیوتا بنا لیا اور آج چین میں اس کی بھی ایک بڑے دیوتا کے طور پر پرستش کی جاتی ہے۔

بدھ مت کی جائے پیدائش ہندوستان کی سرزمین ہے، ایک وقت آیا جب بدھ مت نے برہمن راج کو دیوار سے لگا دیا مگر اس کشمکش میں آخری فتح برہمن راج کو ہوئی اور انھوں نے بدھ مت کو ہندوستان سے نکال دیا۔بدھ کے پیروکار مارے مارے پھرتے رہے پھر وہ چین، مشرقی جزائر، برما، جاپان اور تبت وغیرہ میں پھیل گئے۔آج بھی چین میں بدھ کے پیروکار موجود ہیں اگرچہ جاپان میں شنٹو ازم نے بدھ مت کو پیچھے دھکیل دیا مگر اس کے باوجود بدھ کے پیرو آج بھی جاپان میں پائے جاتے ہیں۔برما اور تبت میں تو اُن کی اکثریت ہے بلکہ تبت میں تو صرف بدھ ہی پائے جاتے ہیں اور وہیں اُن کا دالائی لامہ رہتا ہے۔گوتم بدھ کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ خدا کا قائل نہیں تھا لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی، گوتم بدھ جیسے فلسفی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ خدا منکر ہوگا ذرا دشوار محسوس ہوتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گوتم وحدت الوجود کا قائل تھا اور وحدت الاوجود کے قائلین کے لیے خدا سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اِن لوگوں کے نزدیک ''انا'' کے سوا پوری کائنات وہم وفریب ہے۔یوگی کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی اور موت کے چکر سے بے نیاز اور مایا ولالچ کے جال سے دور روح کائنات میں ضم ہوجائے۔گوتم بدھ کے دور سے پہلے ہندو جوگیوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ طرح طرح کی خوفناک ریاضتوں کے ذریعے مایا کے جال سے نکلنے اور روح کائنات میں ضم ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔جب گوتم بدھ کی آنکھیں کھلیں اور نجات کے لیے اس کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی تو اس کے سامنے بھی یہی فلسفہ آیا اور اس نے برہمنوں کے ہی طریقے پر زندگی اور موت کی کشاکش اور خواہشوں کے جال سے نکلنے کے لیے جدوجہد کی تاہم جلد ہی اُس پر یہ امر واضح ہوگیا کہ مادیت کے غلاف سے نکلنے کے لیے یہ ہولناک ریاضتیں غیر ضروری ہیں اصل شئے نفس کا خواہشوں کے وجود سے پاک ہونا اور روح و دل کا محسوسات کی محبت سے آزاد ہونا ہے۔
چنانچہ جہاں تک تکلیف دہ ریاضتوں کا تعلق ہے اس نے برہمنوں کے طریقے کی اصلاح کر دی اور

تزکیہ نفس اور تجرد کے حصول کے لیے ضابطے بنائے جن میں ظاہری ترک کے بجائے باطنی ترک پر زیادہ زور دیا گیا۔ بدھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مادیت کا جامہ اتار کر روح کائنات میں ضم ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بدھ کے مرنے کے بعد اس کے معتقدین نے اس کو خدا بنا دیا اور اس کی ولادت کے متعلق بے سروپا افسانے پھیلا دیئے۔ انھوں نے بدھ کو اوتار قرار دے دیا اور اس کی پرستش خدا کی حیثیت سے ہونے لگی۔ چین جاپان برما اور تبت میں بدھ کی پرستش ایک خدا یا خدا کے اوتار کے طور پہ ہی کی جاتی ہے۔ بدھ کے شاندار مندر اور عظیم الشان عبادت گاہیں دیکھنے والوں پر حیرت طاری کر دیتے ہیں۔ تبت میں دلائی لامہ کو بدھ کا اوتار خیال کیا جاتا ہے۔ جب وہ مر جاتا ہے تو ساری حاملہ عورتیں اس امید میں رہتی ہیں کہ شاید اگلے لامہ کو وہ جنم دیں اس لیے کہ اُن ہاں خیال کیا جاتا ہے کہ اس دور میں جو بچے پیدا ہوں گے انھی میں سے ایک لامہ ہوگا جسے وہ اس کی مخصوص علامات کی بنا پر پہچان لیں گے۔ اسی طرح اُن میں ایک نئے الٰہ کا انتخاب ہوتا ہے۔ چین کے دوارب ہاتھوں نے صنعت اور تجارت کے ذریعے تو دنیا کو حیران کیا مگر خالق کی تلاش میں وہ بری طرح ناکام رہے اور غیر اللہ کی پرستش ہی میں ہزاروں سال سے مگن چلے آ رہے ہیں انسان کی عقل پر حیرت ہوتی ہے!!!

☆☆☆☆☆☆

ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے سے دل ڈرتا ہے اس لیے کہ ہر لحہ یہ گمان رہتا ہے کہ کوئی جھوٹا خدا پاؤں کے نیچے آ کر کچلا نہ جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے خداؤں کی تعداد تین کروڑ سے زائد ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک، مکھی سے لے کر مچھر تک، سورج سے لے کر چاند تک اور بندر سے لے کر گائے تک سبھی اُن کے معبود ہیں۔ اللہ اُن پہ لعنت کرے جنھوں نے خدا کا اس قدر پست تصور پیش کیا۔ یہ دریاؤں اور سمندروں کی پوجا بھی کرتے ہیں اور درندوں پرندوں کو بھی پوجتے ہیں حتیٰ کہ عضو تناسل تک اُن کے معبودوں میں شامل ہے۔ اور یہ دنیا کی واحد قوم ہے جو اکیسویں صدی میں بھی بت پرستی پہ بضد ہے۔ یہ عریانی اور فحاشی کا مذہب ہے اور رقص اور موسیقی اُن کے مذہب کے لازمی اجزا ہیں اور جسم کی نمائش سے ہندو عورتیں اپنے دیوتاؤں کو خوش کرتی ہیں۔ ویدوں میں سب سے پہلے ہمارے

سامنے "ہزار چشم" آتا ہے۔ جس کو وہ "اِندر" کہہ کے پکارتے ہیں۔ اِندر نے اپنے عمل سے لوگوں کو نشے اور جنسی بے راہ روی کی تعلیم دی۔ اس کے بعد برہما وشنو اور شیو کی تثلیث ہے، برہما خالق ہے، وشنو محافظ ہے شیو مارنے والا ہے۔ برہما جس نے دنیا کو فنا ہونے کے بعد از سرِ نو وجود بخشا اُس کا مندر راجپوتانہ میں ہے۔

جب دنیا پر کوئی آفت آتی ہے تو وشنو خلق کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے آسمانوں سے اترتا ہے۔ وہ بار بار مختلف اوتاروں کی شکل میں اترتا ہے، مشہور ہے کہ وہ دس مختلف شکلوں میں اتر چکا ہے آخری بار وہ کرشن بھگوان کی شکل میں اترا۔ ہندو اپنے اس دیوتا کو جس طرح پیش کرتے ہیں وہ جس طرح اخلاقی پستی کا شکار ہے اور جو مذہبی روایات ہندوؤں میں پھیلی ہوئی ہیں اُس کی تفصیل میں جانا فضول ہے اور اخلاق اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ ہندوازم ایک عجیب گورکھ دھندا ہے جس کا نہ کوئی سر ہے نہ کوئی پیر۔ ایک دیوتا دوسرے سے لڑ رہا ہے، ایک دیوتا دوسرے کی بیوی اٹھا کے لے آیا ہے دوسرا دیوتا اُس کو چھڑانے کی جدوجہد میں مصروف ہے، کسی دیوی کا کسی دوسرے دیوتا سے ناجائز تعلق ہے تو کوئی دیوتا آسمانوں سے اترتا ہی اس لیے ہے کہ عورتوں کے جسم کو غور سے دیکھے اور لطف حاصل کرے۔

اُن کے بعض دیوتا تو ایسے ہیں جو وقت پڑنے پر مرد بن جاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر عورت بن جاتے ہیں جیسا کہ وشنو ہے۔ ساری دنیا میں جس قدر مذاہب رائج ہیں ہندوازم کو اُن میں سب سے پست قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب ایک نگاہ ہندوؤں کے فلسفہ تصوف پہ ڈال لیتے ہیں جس کی بنیاد وحدت الوجود پر رکھی ہے اور اس کی بنیادی غایت یہ ہے کہ ذرہ جدوجہد کرے اور آفتاب بن جائے، قطرہ دریا بن جائے اور بندہ خدا بن جائے۔ اسی منزل کو انھوں نے "انا" کا نام دے رکھا ہے۔ اس منزل تک جو راستہ جاتا ہے اُس کا مقصد روح کو مادہ سے جدا کرنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہندو یوگیوں نے جو طریقے اختیار کیے ہیں اُن کی تفصیل پڑھ کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یوگ حاصل کرنے کے لیے انسان خوفناک حد تک گیا ہے اُس نے اذیت کی آخری حد پہ جا کے دیکھا ہے ظاہر ہے کہ اُسے کچھ حاصل نہیں ہوا اس لیے کہ کچھ حاصل کرنے کا یہ غلط راستہ تھا اور شرف انسانی سے متصادم بھی تھا۔ لیکن انسان اللہ کی عجیب وغریب مخلوق ہے اُس نے

حقیر سے مقاصد کے حصول کے لیے بھی اکثر و بیشتر جان کی بازی لگادی ہے تو پھر خدا بننے کے لیے وہ جان کی بازی کیوں نہ لگا تا۔اس بات میں کوئی شک نہیں ہندو یوگیوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے جس قدر کٹھن راہ کا انتخاب کیا اور جس قدر اذیتیں برداشت کیں اُن کا مقابل مذاہب عالم میں تلاش کرنا مشکل ہے۔مگر یاد رہے کہ انھوں نے یہ اذیت خدا کی رضا حاصل کرنے کے لیے نہیں کی بلکہ خود خدا بن جانے کے لیے کی ہے جو کہ ایک لا حاصل تخلیل ہے اور حالات و واقعات نے ثابت بھی کیا ہے کہ انسان کبھی خدا نہیں بن سکتا جہاں تک اُس کے دعوؤں کا تعلق ہے تو یہ محض عقل کا فتور ہے۔

انسان کے ہاتھ کبھی خالق کے گریبان تک نہیں پہنچ سکے مغرب نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے کہ وہ تخلیق میں خالق کے ساتھ شریک ہونا چاہتے تھے مگر سینکڑوں سال کی جدو جہد کے بعد آج بھی وہ مکھی کا ٹوٹا ہوا پر بنانے پر بھی قدرت حاصل نہیں کر سکے۔بات ہو رہی تھی ہندوؤں کہ انھوں نے کس قدر پست نظریہ حیات اختیار کیا ہے اور عقائد و اعمال میں وہ کس قدر پست ہیں۔ہندومت میں جس قدر دیوتا کی تکریم ہے اُس سے بڑھ کے اُن کے ہاں انت گنت دیویوں کا تصور بھی موجود ہے۔اُن کی دیویوں کی تعداد اور اُن کے ساتھ خود ساختہ نظریات کی تفصیل کے لیے تو ہزاروں صفحات بھی کم پڑ جائیں اس لیے ہم صرف یہ بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ ہندومت میں کبھی بھی کوئی نئی دیوی جنم لے سکتی ہے کسی وقت بھی کسی بوسیدہ اور پرانی دیوی کو متروک قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے کہ اُن کے ہاں نہ دیویوں کی کمی ہے نہ دیوتاؤں کی کمی ہے اور یہ واحد چیز ہے جس میں ہندوستان خود کفیل ہے ورنہ تو باوجود دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے دعویٰ کے وہ اپنے چالیس فیصد لوگوں کو چھت بھی مہیا نہیں کر سکا تو وہ قوم کو روٹی اور زندگی کی دوسری بنیادی ضروریات کہاں سے فراہم کرے گا۔ہندوؤں میں فرقہ پرستی بھی عروج پر ہے اور اُن کے ہاں انسان کے مختلف درجات بھی ہندوازم کو دیگر مذاہب سے الگ کرتے ہیں ہندوازم کے مطابق برہمن ہی اصل انسان کہلانے کا حقدار ہے اس لیے کہ وہ برہما کے سر سے پیدا ہوا،کھتری اُن کے ہاں دوسرے درجے کا شہری ہے جسے کچھ بنیادی حقوق حاصل ہیں اور شودر جن کی وہاں اکثریت ہے وہ برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے وہ نیچ ہیں اور نہ تو ہندو معاشرے میں وہ انسان کہلانے کے مستحق ہیں اور نہ ہی

ہندو معاشرے نے انھیں انسانی حقوق دیئے ہی ہیں۔ ہندو میں تین فرقے اہم ہیں اگرچہ اُن کا اختلاف محض ظاہری ہے حقیقت اور مغز کے اعتبار سے اُن میں کوئی فرق نہیں، اِن میں اول آریا سماج ہیں جو مسلمانوں کے نظریات سے کسی قدر متاثر ہیں اور بت پرستی کو ترک کیے ہوئے ہیں۔ دوسرے سکھ ہیں جن کو توحید کا دعویٰ ہے اگرچہ وہ اب بھی توحید سے کوسوں دور ہیں۔ مگر بت پرستی سے انحراف نے انھیں بہرحال ہندوؤں سے تو ممتاز کر دیا ہے اور وہ ہندومت سے الگ ایک مذہب کا دعویٰ کرتے ہیں جو کسی حد تک درست بھی ہے۔ ہندوستان کے ایک ارب کے قریب لوگ بھی گمراہ ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان میں بسنے والے بیس کروڑ مسلمان بھی گمراہ ہیں۔ ہم یہاں صرف ہندوؤں کا تذکرہ ہندومت کے حوالے سے کر رہے ہیں۔ ہندوؤں نے کئی میدانوں میں ترقی کی ہے، سائنس معیشت، ریاضی ادب اور دیگر فنون میں اُن کی ترقی دیکھی جاسکتی ہے مگر مذہب کے حوالے سے وہ اس قدر پست کیوں ہیں؟؟؟

زندگی کے بارے میں اُن کا نظریہ اس قدر پست کیوں ہے؟؟؟

مذہب اور عقائد کے معاملے میں اُن کا رویہ اس قدر لا ابالی کیوں ہے؟؟؟

مسلمانوں کے اس قدر قریب رہنے اور صدیوں مسلمانوں کے محکوم رہنے کے باوجود حق اُن سے پوشیدہ کیوں رہا؟؟؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سمجھ میں نہیں آتا سوائے اس کے کہ اللہ کو آخر جہنم کے لیے بھی تو لوگوں کی ضرورت ہے۔ شاید اِن لوگوں کی گمراہی میں خالق کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہے یا شاید یہ اُن کے اپنے ہاتھ کی کمائی ہے کہ آخر عقل تو اُن کے پاس بھی ہے پھر وہ خالق کو تلاش کیوں نہیں کرتے۔

توحید ھی حقیقت ھے

اسلام درحقیقت دین توحید ہے۔شرک کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی طرف بیّن اشارات گزر چکے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے جب اہل عرب کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی اور انھیں دین حق کی طرف بلایا تو انھیں شرک سے رُک جانے کی دعوت دیتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ اللہ پر ایمان لاؤ اس لیے کہ اللہ پر تو وہ پہلے سے ایمان رکھتے تھے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے اور بنو اسماعیل کہلاتے تھے اس لیے وہ نہ صرف خدا کو مانتے تھے بلکہ خدا کی بہت سی صفات کے بھی قائل تھے۔اُن میں جو کفر تھا وہ خدا کے انکار کی بنا پہ نہ تھا بلکہ اُن کی بعض عادات کی وجہ سے تھا جن میں وہ لکڑ پتھر اور مٹی کے بنے ہوئے معبودوں کو خدا کی خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے۔انھوں نے بہت سی ایسی رسمیں ایجاد کر لی تھیں جن میں وہ خدا کی صفات میں اپنے بتوں کو شریک کرتے۔چنانچہ اُن کی اِن عملی و اعتقادی گمرائیوں سے یا تو کفر لازم آتا تھا یا شرک۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اِن بدرسومات سے رُک جانے کا حکم دیا اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرانے سے منع کیا یہی بنیادی نزاع تھا جو اسلام اور مشرکین مکہ کے مابین وقوع ہوا۔دوسرا گروہ جو قرآن

کا مخاطب ہے وہ یہود و نصاریٰ تھے جو خدا اور ان کی صفات حسنیٰ کے بھی قائل تھے اور اُن کے لوازم و نتائج کا بھی اقرار کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی بعض عملی اور اعتقادی گمرائیوں میں ملوث ہو گئے تھے اس لیے انھیں بھی راہ راست پر آنے کی ہدایت کی گئی اور انھیں کہا گیا کہ تم صاحب کتاب ہو اپنی کتاب میں دی گئی بشارات کی طرف توجہ کرو اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاؤ۔

انسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو خدا کا مطلق انکار کرنے والے بہت کم دکھائی دیں گے گزری ہوئی اقوام میں کسی نہ کسی نوعیت سے ایک معبود کا تصور ضرور موجود تھا یہ الگ بحث ہے کہ اُن کے اس تصور پر جاہلیت اور اوہام کے کتنے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی اس جدید اور متمدن دنیا میں خدا کا مطلق انکار کرنے والے انسانوں کا جس قدر ہجوم ہے تاریخ کے دریچوں سے اس کی گواہی نہیں ملتی۔ چنانچہ قرآن مجید میں انسان کی توجہ خالص الوہیت کی طرف دلائی گئی اور انھیں توحید خالص کا درس دیا گیا۔ قرآن حکیم چونکہ اللہ کی آخری کتاب ہے اس لیے اس کتاب میں بنی نوع آدم کی تمام گمراہیوں پر گرفت کی گئی ہے اور حقیقت کا آئینہ کھول کر اُن کے سامنے رکھ دیا گیا تا کہ حجت قائم ہو جائے۔ قرآن حکیم نے اس ضمن میں ایسا جامع اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کاملہ مثلاً خلق، رحمت، قدرت، علم، عدل اور حکمت وغیرہ سے متصف ہونا ثابت ہوتا ہے کہ اُن لوگوں پر حجت قائم ہو جائے جو کسی نہ کسی نوعیت سے کسی معبود کا عقیدہ تو رکھتے ہیں لیکن اس کی حقیقی صفات کے تصور سے عاری ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس امر کا اہتمام بھی کیا ہے کہ اُن لوگوں پر بھی حجت تمام کر دی جائے جو سرے سے کسی معبود کے وجود سے انکاری ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کا اہتمام کیا اور قرآن حکیم کے بلیغ ارشادات سے انسانوں کی کج روی دور کرنے کی کوشش کی۔

ارشاد ہوتا ہے کہ!

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

(53) أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ O

القرآن الحکیم (سورۃ السجدہ 53.54/41)

ترجمہ؛

''ہم اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اُن کے اندر سے بھی، یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن بالکل حق ہے۔ اور کیا تیرے رب کا ہر بات کا شاہد ہونا کافی نہیں ہے؟ آگاہ رہو کہ یہ لوگ تیرے رب کے حضور پیشی کے باب میں شک میں ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ (20) وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (21) وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (22) فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الذاریات 20.23/51)

ترجمہ؛

''اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور اس کے اندر بھی، کیا تم نہیں دیکھتے؟ اور آسمانوں میں تمھاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا ہے۔ پس زمین و آسمان کے مالک کی قسم! یہ بات یقینی ہے جو آپ اُن کو بتا رہے ہیں''۔

☆☆☆☆☆☆

اوپر تحریر کی گئی آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ غور کرنے والوں کے لیے اُن کے سامنے پھیلی کائنات میں توحید کی بیشمار نشانیاں پھیلی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے پر دلیل پیش کرتی ہیں۔ کائنات کے حسن و جمال پہ ایک نگاہ کریں کہ رنگ و نور کے کیسے کیسے جلوے ہیں جو آسمانوں سے لے کر زمین تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر انسان نگاہ ادراک کھلی رکھے تو ہر قدم پر خالق کی صناعی اُس کا راستہ روکے گی۔ حتیٰ کہ زمین و آسمان کا کوئی گوشہ نہیں جہاں سے انسان غافل و بے پرواہ گزر سکے اور خالق کی صناعی پر اُس کا دل نہ دھڑکے۔ انسان کے اندر حسن کا احساس ودیعت کر دیا گیا ہے چنانچہ کوئل کی نغمگی ہو یا آبشاروں کی سرسراہٹ، آسمان پر دھیمی دھیمی لَو دیتے ستارے ہوں یا چمکتا دمکتا چاند، سورج کی بے پناہ چمک ہو یا آسمان پر مصوری کے شاہکار بناتے بادل، خاموشی اور وقار سے بہتے دریا ہوں یا چنگاڑتے ہوئے سمندر، برف پوش وادیوں کی مہک ہو یا لق ودق صحراؤں کی خامشی، بہار کی مستی ہو یا خزاں کا حزن سب میرے اللہ نے پیدا کیا ہے اس لیے فرمایا گیا ہے کہ!

الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ۔

(السجدہ ۳۲:۷)

اُس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔

☆☆☆☆☆☆

پھر فرمایا!

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

(المومنون ۲۳:۱۴)

پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا۔

☆☆☆☆☆☆

ظاہر ہے کہ دنیا اپنی بقا کے لیے اِن تمام رنگا رنگ حسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی، ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی مگر اس میں یہ باغ و چمن، یہ نشیب و فراز، یہ وادی و کہسار نہ ہوتے، ممکن تھا کہ یہ فضا تو ہوتی

مگر اس میں بادِ نسیم کے جھونکے نہ ہوتے، پرندوں کے نغمے نہ ہوتے، صبح کی سفیدی نہ ہوتی، شام کی شفق نہ ہوتی، قوس قزح نہ ہوتی، ساون رُت نہ ہوتی، ستاروں کی چھاؤں کہکشاؤں کی جلوہ آرائیاں نہ ہوتیں، سوال یہ ہے کہ دنیا کو اس قدر جلووں سے کیوں مزین کیا گیا ہے؟ اس کا جواب بھی قرآن ہی نے دیا ہے کہ یہ سارا اہتمام اس لیے کیا گیا تاکہ انسان کی حس باطن کو بیدار کیا جا سکے اور وہ جانے کہ جس نے اُس کو خلق کیا ہے اُس کی صناعی کس قدر لاجواب ہے، وہ کمال صنعت وحکمت اور کمال خیر و برکت میں کس قدر بڑھا ہوا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ!

أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ (6) وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ (7) تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ O

القرآن الحکیم (سورة ق 6.8/50)

ترجمہ؛

''کیا انھوں نے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کس طرح ہم نے اس کو بنایا ہے اور سنوارا ہے اور کہیں اس میں کوئی رخنہ نہیں چھوڑا اور زمین کو بھی تو ہم نے ہی بچھایا ہے اور اس میں پہاڑ گاڑ دیئے اور ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگائیں، ہر طرف متوجہ ہونے والے بندے کی بصیرت اور یاد دہانی کے لیے''۔

☆☆☆☆☆☆

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ!

أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ (71) أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ (72) نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ (73) فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (74) فَلَا أُقْسِمُ

بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ (75) وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ O

القرآن الحکیم (سورۃ واقعہ 71.76/56)

ترجمہ:

''ذرا غور کرو اس آگ پر جس کو تم جلاتے ہو کیا تم نے پیدا کیا ہے اس کے درخت کو یا ہم نے اس کو پیدا کیا ہے؟ ہم نے اس کو یاد دہانی اور صحرا کے مسافروں کے لیے نہایت نفع بخش چیز بنا دیا ہے۔ سو تم اپنے رب کی تسبیح بیان کرو، سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی جگہ کی اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے''۔

☆☆☆☆☆☆

یہ دنیا اور اس کائنات کے اجزاء حسن و جمال کا کمال ہیں، ہر حقیقت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کوئی مدبر، کوئی خالق ہے، کوئی بہت ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ ہے جس کی کاریگری کے چرچے ہیں۔ ایک حسین عورت کی سرسری سی نگاہ کسی زاہد و عابد کی پارسائی کو مٹی مٹی کر سکتی ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ قدرت کی صناعی اپنے عروج کمال کو چھو رہی ہے۔ کائنات کا قرینہ ایک اہتمام کو ظاہر کر رہا ہے اب اگر دو خدا ہوتے تو اس اہتمام میں اُن کی مرضی میں اس قدر اِتصال ممکن ہی نہ تھا اس لیے کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کی توحید پر دلیل ہے مگر کوئی سوچے تو!!!

کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق اور سازگاری جو اس دنیا کے مختلف اجزاء میں پائی جاتی ہے اور ضدین کے مابین جو موافقت ہے اُسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کی اس رنگا رنگی میں ایک مدبر کی کارفرمائی ہے۔ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عورت کو ایک مرد سے کس قدر مختلف بنایا ہے اور وہ مرد سے کس قدر الگ اور ممتاز خصوصیات کی حامل ہے۔ مگر اُس کی تمام خصوصیات، اُس کا تمام حسن، اُس کی تمام رعنائی مرد کی نگاہ الفت کی محتاج ہے۔ یعنی مرد اور عورت مخالف و متضاد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ شدید روحانی اور جسمانی اتصال کی خواہش رکھتے ہیں۔ جو کچھ مرد کو مطلوب و مرغوب ہے وہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو فراہم کر دیا اور جو کچھ عورت کی خواہش تھی اُس کا عکس مرد کی ذات میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگر عورت نہ ہو تو مرد کی ہستی اس کی قوتوں اور قابلیتوں

کا بڑا حصہ بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے۔اور اگر مرد نگاہ نہ کرے تو عورت کا حسن و جمال حتیٰ کہ نسل آگے بڑھانے کی عورت کی خصوصیت بھی کسی کام کی نہیں۔چنانچہ آسان لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا جواب بنایا ہے ایک کے بغیر دوسرا اور دوسرے کے بغیر پہلا نامکمل ہے۔ٹھیک یہی حال کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے جیسے کہ زمین و آسمان، روز و شب، سردی و گرمی، دھوپ و چھاؤں، دن و رات، نور و ظلمت، حرارت و برودت سب کا زوجین کا سا اختلاف ہے اور وہ انھی کا سا شدید اتصال رکھتی ہیں۔حد تو یہ ہے کہ جس طرح عورت و مرد کا وجود ایک دوسرے کے بغیر بے غایت و عبث ہے اسی طرح کائنات کے دوسرے زوجین بھی اپنے جوڑے کے بغیر اُس مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے نہ ملیں۔کائنات کی ہمہ رنگی پہ نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ توافق اور موافقت کا یہ رشتہ صرف ضدین تک ہی محدود نہیں بلکہ کائنات میں ہر طرف ایک ہمہ گیر توافق و سازگاری ہے جو کسی مدبر کی تدبیر کی شہادت ہے۔

چنانچہ دیکھیں کہ کائنات کا ہر ذرہ ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشو نما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ کائنات کا پورا کارخانہ اُس کے لیے سرگرم ہو جائے۔اس لیے کہ اس اہتمام کے بغیر تو گندم کا ایک دانہ بھی منزل نہیں پا سکتا۔گیہوں کا ایک پودا اُس وقت تک تکمیل سے عاری رہے گا جب تک اُس اہتمام اور نگہداشت پہ متعین تمام عوامل سرگرم نہ ہو جائیں جن کو قدرت نے اس کام کے لیے متعین کیا ہے۔دیکھیں کہ گیہوں کے بیج کے لیے زمین کو گہوارہ بنایا گیا، ابر کو حکم کیا گیا کہ اُس کو رطوبت فراہم کرے، سورج کو حکم دیا کہ اس ننھے سے بیج کو مرنے نہ دینا، جلنے نہ دینا، بلکہ مطلوب حرارت اُس تک پہنچاتے رہنا۔شبنم کو حکم دیا کہ اس کو ٹھنڈا رکھنا، ہواؤں کو حکم دیا کہ جب وہ بیج سر نکال لے تو اس کو لوری دینا، اور سورج کو مقرر حکم دیا کہ جب وہ جوان ہو جائے تو اُس کو خوب گرمی پہنچانا تا کہ وہ استعمال کے قابل ہو جائے۔گندم کا ایک دانہ قدرت کے اتنے اہتمام کے بعد کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے حد تو یہ ہے کہ اُس دانے نے کس پیٹ میں جانا ہے لوح و محفوظ میں لکھ لیا گیا ہے۔سبحان اللہ

اس مثال سے اب اس امر میں تو کوئی شک نہیں رہ گیا کہ اس کائنات کے نظم کے پیچھے ایک حکیم و قوی

ارادہ ہے جو اس کے نظم کو تھامے ہوئے ہے۔ظاہر ہے وہ حکیم علم وقدرت اور ربوبیت وحکمت کی تمام صفات سے متصف ہے۔وہی ہے جو اپنے علم وحکمت سے کائنات کے اجزائے مختلفہ میں ربط و اتصال پیدا کرتا ہے اور اُن کو صالح مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ساتھ ہی اس امر کی شہادت بھی مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک، اور زمین وآسمان کے درمیان صرف ایک ہی ہے جو مالک ومتصرف ہے اور کوئی اس کے ارداے میں اُس کا شریک نہیں ہے۔اگر زمین وآسمان کے الگ الگ ناظم ومدبر ہوتے یا نظم کائنات میں بہت سے ارادوں کی کارفرمائی ہوتی یا خیر وشر اور نور وظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے اجزا میں یہ زوجین کا سا توافق کیسے ممکن ہوتا جس کا مشاہدہ کائنات کے گوشہ گوشہ میں کیا جا سکتا ہے۔قرآن حکیم میں ہمارے اس استدلال کو استحکام فراہم کرنے والی بہت سی آیات نازل کی گئی ہیں ہم صرف چند آیات تحریر کرنے پہ اکتفاء کریں گے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ٥ فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ٥ وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ٥

القرآن الحکیم (سورۃ الذاریات 51.49/51)

ترجمہ؛

''اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تا کہ تم یاد دہانی حاصل کرو پس اللہ کی طرف بھاگو ،میں اُس کی طرف سے تمہیں ایک کھلا ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ، میں اُس کی طرف سے تمہارے لیے کھلا ہوا ڈر لے کے آیا ہوں''۔

☆☆☆☆☆☆

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ!

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (6) الَّذِي خَلَقَكَ

فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ (7) فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاء رَكَّبَكَO

القرآن الحکیم (سورۃ النفطار 6.8/82)

ترجمہ؛

''اے انسان! تجھے تیرے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔جس نے تیرا خاکہ بنایا پھر تیرے نوک پلک سنوارے اور تجھے بالکل موزوں کیا اور جس شکل پہ چاہا تجھے متشکل کردیا''۔

☆☆☆☆☆☆

انسان کے حسن پہ ایک نگاہ دوڑائیں تو آپ جانیں گے کہ یہ محض خلق نہیں بلکہ خلق کمال ہے۔انسان کی اس سے بہتر صورت ممکن ہی نہ تھی۔پھر حسن کے ساتھ ہی انسان کو بہت بڑا عہدہ بھی عطا کردیا اور فرمایا انسان دنیا میں میرا نائب ہے میرا خلیفہ ہے۔اور زمین وآسمان کو حکم دیا کہ میرے خلیفہ کے لیے موافق ہوجاؤ اور دیکھو اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے تاکہ وہ فریضہ خلافت احسن طریقے سے ادا کرسکے۔مگر افسوس کہ انسانوں کی اکثریت نے اپنے ارفع منصب ومقام کو نہ پہچانا اور جانوروں کی سطح پر اتر آئی۔چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے احسانات اور انسان کے ارفع مقام کی یاد دہانی کا ایک تسلسل ہے چند آیات پہ نگاہ دوڑائیں۔۔

ارشاد ہوتا ہے کہ!

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُواْ رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (21) الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الأَرْضَ فِرَاشاً وَالسَّمَاء بِنَاء وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ فَلاَ تَجْعَلُواْ لِلّهِ أَندَاداً وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَO

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 21.22/2)

ترجمہ؛

''اے لوگو اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔اُسی نے اُن کو بھی پیدا کیا تھا

جوتم سے پہلے ہوگزرے ہیں تا کہ تم دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔اسی کی بندگی کرو جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور اتارا آسمان سے پانی اور اُگائے تمہارے لیے طرح طرح کے پھل تمہاری روزی کے لیے تا کہ تم دوسروں کو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، درآنحالیکہ تم جانتے ہو"۔

☆☆☆☆☆☆

آگے مزید ارشاد ہوتا ہے!

وَإِلَـهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لاَّ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ (163) إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاء فَأَحْيَا بِهِ الأرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخِّرِ بَيْنَ السَّمَاء وَالأَرْضِ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (164)

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 163.164/2)

ترجمہ؛

"اور تمھارا ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان ہے رحیم ہے، بے شک آسمانوں اور زمینوں کی خلقت، رات و دن کی آمد و شد، اور اِن کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندروں میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں، اور اس پانی میں جسے اللہ نے اتارا بادلوں کے ذریعے جس سے زمین کو موت کے بعد زندگی ملتی ہے اور جس سے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے، اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو زمین و آسمان کے مابین مامور ہیں اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

☆☆☆☆☆☆

آفاق وانفس میں خدا کی توحید کی جو نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کے متعلق یہاں بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ صرف اُن لوگوں کو نظر آتی ہیں جو غور کرنے والے ہیں اور اپنے رب کی قدرت سے آگاہ ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں تب کائنات کی ہمہ رنگی انھیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور پوری کائنات اُسے ایک ہی پیغام دیتی نظر آتی ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہی اس قابل ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَاللّٰهُ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِيْ ذَلِكَ لآيَةً لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ (65) وَإِنَّ لَكُمْ فِيْ الأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِيُكُم مِّمَّا فِيْ بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَناً خَالِصاً سَآئِغاً لِلشَّارِبِيْنَ (66) وَمِن ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَراً وَرِزْقاً حَسَناً إِنَّ فِيْ ذَلِكَ لآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (67) وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ (68) ثُمَّ كُلِيْ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً يَخْرُجُ مِن بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيْهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِيْ ذَلِكَ لآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 65.69/16)

ترجمہ؛

''اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا پس اس سے زمین کو زندہ کر دیا اس کے خشک ہوجانے کے بعد، بے شک اس میں اِن لوگوں کے لیے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں۔ بے شک تمہارے لیے چوپائیوں میں بھی بڑا اسبق ہے کہ ہم اِن کے پیٹوں کے اندر گوبر اور خون کے درمیان سے تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہوتا ہے، اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی، تم اِن سے نشہ کی

چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی، بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں، اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر القا کیا کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں اُن میں چھتے بنا، پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس، پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل، اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے بے شک اس کے اندر بھی بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں"۔

اشاریہ

(۱)

جدید جاہلیت ،(ص۔35)

محمد قطب

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۲)

جدید جاہلیت ،(ص۔35)

محمد قطب

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۳)

ان آیات کا ترجمہ تفہیم القرآن سے درج کیا گیا۔

تفہیم القرآن ۔سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۴)

ان آیات کا ترجمہ تفہیم القرآن سے درج کیا گیا۔

تفہیم القرآن ۔سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۵)

انساان اور کائنات،(ص۔35)

سیّد علی عباس جلالپوری

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(٦)

مثالیت پسندی کا حقیقی آغاز فیثا غورث کے زمانے سے شروع ہوا جس کی تعلیمات کی اشاعت سے عارفی مت میں بھی مثالیت رواج پا گئی۔

سیّد علی عباس جلالپوری

انسان اور کائنات ص : 185

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۷)

اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہی یورپ میں کلیسا سے آزادی کی خواہش سر اٹھانے لگی۔

انسان اور کائنات ۔۔۔۔

سیّد علی عباس جلالپوری

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۸)

جرمن وہ دیگر فلاسفہ نے مذہب اور کائنات کے باہمی تعلق کو اجاگر کرنے کی کوشش میں مزید الجھادیا جس سے مذہب بیزار طبقہ کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔

افتخار احمد افتخار

سیرۃ المزمل ﷺ (جلد اول۔خالق کی تلاش)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۹)

فلسفہ رواقیت کو مادیت پسندوں کے ہاں بہت مقبولیت حاصل ہوئی

انسان اور کائنات

سیّد علی عباس جلالپوری

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۰)

حقیقت یہ ہے کہ خالق کی پہچان علم وحی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ہم نے اہل فلسفہ کے تصور الٰہ میں جانا کہ انھوں نے خالق کی پہچان کے ہر مرحلے پر ٹھوکر کھائی ہے۔اس لیے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے علم فلسفہ کوئی بنیاد فراہم نہ کر سکی اور اہل فلسفہ لوگوں کو خالق کے در تک نہ لے جا سکے بلکہ اُن کا تصور الٰہ اتنا لایعنی اور ناتواں تھا کہ اسے خالق سمجھنا ہی عبث تھا۔تاہم اتنا ضرور ہے کہ فلاسفہ نے عقل وخرد کے ذریعے جو نظریات وضع کئے انھوں نے لوگوں کو خدا کا انکار کرنے کی بجائے اُس کے وجود کو تسلیم کرنے پہ مائل کیا۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۱)

اگر چہ بیسویں صدی کے سائنسدانوں اور فلاسفہ نے ایک خدا کی ضرورت کو حتمی قرار دے دیا مگر وہ اپنے سماج میں خدا کے تصور کو داخل نہ کر سکے اس لیے کہ اُن کے منتشر سماجی ڈھانچ میں اب کسی خدا کی ضرورت نہیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۲)

اگر چہ بیسویں صدی کے سائنسدانوں اور فلاسفہ نے ایک خدا کی ضرورت کو حتمی قرار دے

دیا مگر وہ اپنے سماج میں خدا کے تصور کو داخل نہ کر سکے اس لیے کہ اُن کے منتشر سماجی ڈھانچے میں اب کسی خدا کی ضرورت نہیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۳)

رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سکھائی تھی۔

صحیح مسلم (جلد اول۔ باب کتاب المسافر)

امام حجاج بن مسلم قشیری

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۴)

ہندوستان کے دور دراز پہاڑی علاقوں میں ناگا قبائل کے کچھ لوگ آج تک ٹوٹم مت پہ قائم ہیں اور قدیم مذہبی روایات سے وابستہ ہیں۔

سیّد علی عباس جلالپوری

انسان اور کائنات (ص ؛ 39)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۵)

فرائیڈ کا یہ مذہبی تخیل اُس کی کم نگاہی اور کثرت گمراہی کا ثبوت ہے۔ وہ لوگوں کی مذہب کے ساتھ وابستگی سے چڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ زمانے کے بدلتے رنگوں کے ساتھ انسان مذہب سے نہ جانے کیوں چمٹا رہا مگر اُس نے اپنے اندر اٹھتے اس سوال کو نظر انداز کیا ورنہ شاید وہ بھی ایک مذہبی آدمی ہوتا۔ دوسری طرف اس بات سے حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اپنی تمام تر مذہبی بیزاری کے وہ اپنی تحریروں میں ایک متشدد یہودی دکھائی دیتا ہے اور یہودیت پہ حرف نہیں آنے دیتا دوسری طرف اُس کی خالق سے بے زاری سے اُس کا

فکری تضاد جھانکتا ہے۔

مولف ؛ سیرۃ المزملؐ

افتخار احمد افتخار

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۶)

روح کا تصور قدیمی ہے۔ مذہبی لوگ اکثر و بیشتر اس تصور کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

انسان اور کائنات (ص ؛ 47)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۷)

مذہبی اخلاق کا یہ پہلو متقلمین کے تخیل کی نفی ہے۔ بلکہ یہ ان مادیت پسندوں کی اختراع ہے جو انسانوں کی ہر پریشانی کا جواز مذہب پرستی میں تلاش کرتے ہیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۸)

جدید جاہلیت ،(ص۔39)

محمد قطب

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۱۹)

ان آیات کا ترجمہ تفہیم القرآن سے درج کیا گیا۔

تفہیم القرآن ۔

سیّدابوالاعلی مودودیؒ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(۲۰)

سائنس کی اس نارسائی کا اعلان خود اہل سائنس کرتے ہیں، روحانیت پسندوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کتابیات

جدید جاھلیت ۔۔۔۔ محمد قطب

انسان اور کائنات۔۔۔علی عباس جلالپوری

اسلام اور جدید ذھن کے شبہات۔۔۔محمد قطب

تفہیم القرآن۔۔۔ سید ابو اعلیٰ مودودی

تدبر القرآن۔۔۔۔۔ امین احسن اصلاحی

سیرۃ المزمل۔۔۔۔۔افتخار احمد افتخار

صحیح مسلم۔۔۔۔۔ مسلم بن حجاج قشیری

تاریخ اسلام۔۔۔۔۔ معین الدین شاہ ندوی

مسلمان امتیں۔۔۔۔۔ ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام اور عصر حاضر۔۔۔ مولانا وحید الدین

خطبات۔۔۔۔۔۔۔سید ابو اعلیٰ مودودیؒ

پردہ۔۔۔۔۔۔۔سید ابو اعلیٰ مودودیؒ

کشت زر بار۔۔۔ پروفیسر احمد رفیق اختر

خطبات بہاولپوری۔۔۔۔ڈاکٹر حمید اللہ

بلوغ الارب ۔۔۔۔۔ علامہ محمود شکری آلوسی

روایات تمدن قدیم۔۔۔۔سیّد علی عباس جلالپوری

تمدن ہند۔۔۔۔۔۔۔ سیّد علی بلگرامی

احکام القرآن۔۔۔۔امام رزای

قانون اسلام۔۔۔۔ سر سید احمد خان

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Westren Authors.

J-G Freezar........Man God and Immortality

Jon Haksly.......Religion Without Revelation

S. Hussan Naser...Islamic Science.

Philps Hitty... History of Arabs.

Springler...Fall of west.

Briffault...The making of Humanity.

Mont Watt...History of Islamic Spain.

James jeans..The Mysterious Univers.

Edendton...The age of analysis.

Ameer Ali... The Spirit of Islam.

..